ماہنامہ

پیام عرفات

رائے بریلی

امید کی ایک کرن

آج ہمیں پھر انتظار ہے اُن سعید روحوں اور بہادر انسانوں کا جو اس ملک کو تباہ ہونے سے پہلے بچالیں، ہمیں اندیشہ ہے کہ ان سیاسی لوگوں اور خود غرضوں کے ہاتھوں جو ہر مسئلہ کو اپنی پارٹی کے نقطہ نظر سے سوچتے ہیں، ملک تباہ نہ ہو جائے، ہمیں امید ہے کہ خدا اس ملک سے بڑا کام لے گا، یہاں بڑے بڑے لوگ پیدا ہوئے، مسلمانوں میں بھی، غیر مسلموں میں بھی، ان لوگوں نے دور دراز خطوں تک پریم راگ پہنچایا ہے، محبت کو عام کیا ہے، خدا اس ملک کو مہلت دے گا اور موقع دے گا کہ یہ ملک زوال و پستی سے نکل آئے، یہ ملک اپنے کو بھی بچائے گا اور اس دنیا کو بھی بچائے گا جو ڈوبنے کو ہے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

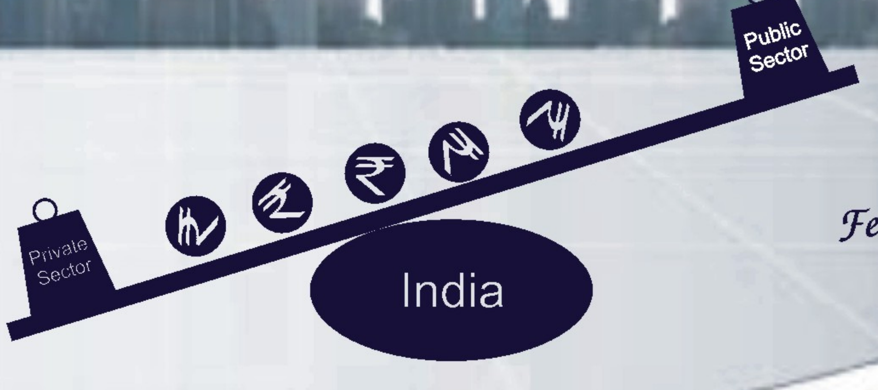

Rs. 15/-
February 2021

مرکز الإمام أبی الحسن الندوي
دارعرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا

مولانا ابوالکلام آزادؒ

''عزیزو! تبدیلیوں کے ساتھ چلو، یہ نہ کہو کہ ہم اس تغیر کے لیے تیار نہ تھے، بلکہ اب تیار ہو جاؤ، ستارے ٹوٹ گئے لیکن سورج تو چمک رہا ہے، اس سے کرنیں مانگ لو اور ان اندھیری راہوں میں بچھا دو' جہاں اجالے کی سخت ضرورت ہے۔

میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ تم حاکمانہ اقتدار کے مدرسے سے وفاداری کا سرٹیفکٹ حاصل کرو اور کاسہ لیسی کی وہی زندگی اختیار کرو جو غیر ملکی حاکموں کے عہد میں تمہارا اشعار رہا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جو اجلے نقش و نگار تمہیں اس ہندوستان میں ماضی کی یادگار کے طور پر نظر آ رہے ہیں' انہیں بھلاؤ نہیں، انہیں چھوڑو نہیں، ان کے وارث بن کر رہو اور سمجھ لو کہ اگر تم بھاگنے کے لیے تیار نہیں تو پھر تمہیں کوئی طاقت بھگا نہیں سکتی۔ آؤ عہد کرو کہ یہ ہمارا ملک ہے، ہم اس کے لیے ہیں اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے ہی رہیں گے۔

آج زلزلوں سے ڈرتے ہو، کبھی تم خود اک زلزلہ تھے، آج اندھیرے سے کانپتے ہو' کیا یاد نہیں کہ تمہارا وجود ایک اجالا تھا، یہ بادلوں نے میلا پانی برسایا ہے، تم نے بھیگ جانے کے خدشہ سے اپنے پائنچے چڑھا لیے ہیں، وہ تمہارے ہی اسلاف تھے جو سمندر میں اتر گئے، پہاڑوں کی چھاتیوں کو روند ڈالا، بجلیاں آئیں تو ان پر مسکرا دیے، بادل گرجے تو قہقہوں سے جواب دیا، صرصر اٹھی تو اس کا رخ پھیر دیا، آندھیاں آئیں تو ان سے کہا کہ تمہارا راستہ یہ نہیں ہے۔ یہ ایمان کی جاں کنی ہے کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے' آج خود اپنے گریبانوں سے کھیلنے لگے اور خدا سے اس درجہ غافل ہو گئے کہ جیسے اس پر کبھی ایمان ہی نہیں تھا۔

عزیزو! میرے پاس تمہارے لیے کوئی نیا نسخہ نہیں ہے، وہی پرانا نسخہ ہے جو برسوں پہلے کا ہے، وہ نسخہ جس کو کائنات انسانی کا سب سے بڑا محسن لایا تھا، وہ نسخہ ہے قرآن کا یہ اعلان کہ ﴿وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ﴾''

(خطبات آزاد: ۳۲۱-۳۲۲)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو اور ہندی میں شائع ہونے والا

ماہنامہ

پیام عرفات

رائے بریلی

مرکز الامام أبی الحسن الندوی دارعرفات تکیہ کلاں رائے بریلی (یوپی)

جلد: ۱۳ فروری ۲۰۲۱ء- جمادی الاخری ۱۴۴۲ھ شمارہ: ۲

سرپرست: حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہٗ (صدر، دارعرفات)

مجلس ادارت

بلال عبدالحی حسنی ندوی

مفتی راشد حسین ندوی

عبدالسبحان ناخدا ندوی

محمود حسن حسنی ندوی

محمد حسن ندوی

معاون ادارت

محمد نفیس خاں ندوی

محمد ارمغان بدایونی ندوی

مؤمن کی شان

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ:

"اَلْمُؤْمِنُ یَأْلَفُ وَیُؤْلَفُ وَلَا خَیْرَ فِی مَنْ لَا یَأْلَفُ وَلَا یُؤْلَفُ وَخَیْرُ النَّاسِ أَنْفَعُھُمْ لِلنَّاسِ"

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

(مؤمن محبت کرتا ہے اور اس سے محبت کی جاتی ہے، ایسے شخص میں کوئی خیر نہیں جو نہ محبت کرتا ہو اور نہ اس سے محبت کی جاتی ہو، لوگوں میں سب سے بہترین وہ شخص ہے جو لوگوں کے لیے زیادہ نفع بخش ہو)

(المعجم الأوسط للطبرانی: ٥٧٨٧)

پرنٹر پبلشر محمد حسن ندوی نے ایس، اے، آفسٹ پرنٹرس، مسجد کے پیچھے، پھاٹک عبداللہ خاں، سبزی منڈی، اسٹیشن روڈ، رائے بریلی سے طبع کرا کر دفتر "پیام عرفات" مرکز الامام أبی الحسن الندوی، دارعرفات، تکیہ کلاں رائے بریلی سے شائع کیا۔

www.abulhasanalinadwi.org

فی شمارہ: -/Rs.15 E-Mail: markazulimam@gmail.com سالانہ زر تعاون: -/Rs.150

Markazul Imam Abil Hasan Al-Nadwi Samiti (Punjab National Bank) A/c No. 6127002100000339 (IFSC: PUNB0612700)

فہرس

موجودہ حالات اور ہماری ذمہ داریاں (اداریہ)........۳
.............بلال عبدالحی حسنی ندوی
ہندوستان کی بقاو عزت کا واحد راستہ..........۴
........مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ
قیادت کی مطلوبہ صفات...........۶
.........حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ
ذرائع ابلاغ کی تاثیر وقوت..........۸
.........مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی
سچائی کیا ہے؟ (مسلسل)..........۹
.........بلال عبدالحی حسنی ندوی
نسبتوں کی حقیقت.........۱۱
.........عبدالسبحان ناخدا ندوی
عقیقہ کے احکام (۲)........۱۳
.........مفتی راشد حسین ندوی
مسلم سائنسداں الزہراوی........۱۵
ہندوستان - نجکاری کی زد میں........۱۶
.........سید محمد مکی حسنی ندوی
اسلام کا تصورِ دعوت.........۱۸
.........محمد ارمغان بدایونی ندوی
اصول اور فروع کی عدم تمیز.........۱۹
.........محمد نفیس خاں ندوی

عرفان محبت

نتیجۂ فکر:- جگر مرادآبادیؒ

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کی بات نہیں
فیضان محبت عام سہی عرفان محبت عام نہیں

یہ تو نے کہا کیا اے ناداں! فیاضیٔ قدرت عام نہیں
تو فکر ونظر تو پیدا کر کیا چیز ہے جو انعام نہیں

یارب! یہ مقام عشق ہے کیا گو دیدہ و دل ناکام نہیں
تسکین ہے اور تسکین نہیں، آرام ہے اور آرام نہیں

کیوں مست شراب عیش وطرب تکلیف توجہ فرمائیں
آواز شکست دل ہی تو ہے آواز شکست جام نہیں

آنا ہے جو بزم جاناں میں پندار خودی کو توڑ کے آ
اے ہوش وخرد کے دیوانے یاں ہوش وخرد کا کام نہیں

زاہد نے کچھ اس انداز سے پی ساقی کی نگاہیں پڑنے لگیں
مے کش یہی اب تک سمجھے تھے شائستہ دور جام نہیں

عشق اور گوارا خود کر لے بے شرط شکست فاش اپنی
دل کی بھی کچھ ان کے سازش ہے تنہا یہ نظر کا کام نہیں

سب جس کو اسیری کہتے ہیں وہ تو ہے امیری ہی لیکن
وہ کون سی آزادی ہے یہاں جو آپ خود اپنا دام نہیں

مدیر کے قلم سے

بلال عبدالحی حسنی ندوی

موجودہ حالات اور ہماری ذمہ داریاں

اسلام کی ساڑھے چودہ سو سالہ تاریخ عروج وزوال کے واقعات سے بھری پڑی ہے، جو روشنی غار حراء سے نکلی' اس نے سو سال کے اندر دنیا کے ان خطوں کو بھی روشن کردیا جہاں سینکڑوں سال سے ظلمتوں کا بسیرا تھا، آٹھ سو سال مسلمانوں نے پورے کروفر کے ساتھ دنیا پر حکومت کی اور حقیقت میں یہ اس ایمان واخلاق کی طاقت کا امتداد تھا جس کا سرچشمہ آنحضور ﷺ کی ذات گرامی تھی، جس سے ایمان و اخلاق کے وہ سوتے جاری ہوئے جو صحابہ کرام کے ذریعہ دنیا کے کونے کونے تک پہنچے، جب تک حکومتوں نے ان سے رابطہ مضبوط رکھا' ان میں کسی نہ کسی درجہ مضبوطی قائم رہی، پھر آہستہ آہستہ رسی ڈھیل ہونی شروع ہوئی، فتنوں نے سر اٹھایا، آپس کی خانہ جنگیاں شروع ہوئیں اور حالات ابتر ہونے لگے، عالم اسلام نے تاتاریوں کا حملہ بھی دیکھا، اپنے وقت کے سب سے بڑے مرکز دار الخلافہ بغداد کو تاخت وتاراج ہوتے ہوئے بھی دیکھا، لگتا تھا کہ قیامت آگئی اور اب مسلمانوں کا وجود مٹ جائے گا، مگر ان ہی اندھیروں میں علم کی قندیلیں لیے کچھ وہ ہمت والے بھی تھے جنہوں نے دکھادیا کہ اسلام ایک سدابہار درخت ہے، ان میں حافظ ابن حجر بھی تھے جنھوں نے ''فتح الباری'' لکھ کر ساری امت پر احسان کیا، ابن تیمیہ بھی تھے جن کے علم کی گہرائی اور دوسری طرف امت کی فکر نے ایک نئی راہ دکھائی، ان ہی میں شیخ جمال الدین ایرانی بھی تھے جن کی زبان کی نورَس حلاوت نے تاتاریوں کی تیموری شاخ کو اسلام کی جھولی میں ڈال دیا۔

آج ہندوستان میں جو حالات ہیں، ان سے ہر شخص ہراساں ہے، مگر دور جانے کی ضرورت نہیں، ملک کی تقسیم کے وقت حالات اس سے بھی ابتر تھے اور نہیں لگتا تھا کہ مسلمان پھر ایک نئے حوصلہ کے ساتھ سامنے آسکیں گے، مگر اللہ تعالیٰ اس وقت کے علماء اور اصحاب فکر کی قبروں کو نور سے بھردے کہ انہوں نے اپنی فکرمندی اور صائب رائے سے نیا راستہ نکالا اور مدارس اسلامیہ کے ذریعہ اسلام کے قلعے تعمیر کیے، جہاں سے اسلام کی حفاظت کا کام ہوا۔

اب پھر اس ملک میں اسلام کی کشتی ڈانواڈول ہے، پھر ضرورت ہے اسی ایمان واخلاق کی اور فکرمندی اور دل سوزی کی، پھر ضرورت ہے ایسے جیالوں کی جو ہمت مرداں مدد خدا کے اصول کو سامنے رکھ کر میدان عمل میں آئیں اور پوری حوصلہ مندی کے ساتھ ملت کی کشتی کا سہارا بنیں اور پھر اپنی ایمانی طاقت اور اخلاق کی بلندی سے دکھادیں کہ اسلام کے درخت اقبال کو کبھی گھن نہیں لگ سکتا، ہوسکتا ہے کہ وہ کہیں کہیں سے مرجھانے لگے، لیکن اس کی شاخوں میں آج بھی شادابی ہے۔

مایوسی اور غفلت سے اوپر اٹھ کر کام کرنے کی ضرورت ہے، ایمان کی طاقت مایوسی کے بادل چھانٹ دیتی ہے، وہ ہمت پیدا کردیتی ہے کہ کسی لحہ بھی آدمی مایوس نہیں ہوتا، اخلاق ومحبت سے وہ دلوں کو فتح کرتا جاتا ہے، اصل ضرورت ہے ایمان واخلاق کی طاقت پیدا کرنے کی، ہمت سے کام لینے کی، مایوسی اور غفلت کو دور کرنے کی، میدان عمل میں آنے کی اور کردار کے جوہر چمکانے کی، سوتوں کو جگانے کی اور جاگے ہوؤں کو کام پر لگانے کی.. (باقی صفحہ نمبر ۷ پر)

ہندوستان کی بقا وعزت کا واحد راستہ

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

ہندوستان میں تقریباً ایک ہزار برس سے ہندو، مسلمان اکٹھے رہتے ہیں، شہروں، قصبات، دیہاتوں اور محلوں میں ان کی ملی جلی آبادی اور مشترک سکونت ہے، بازاروں، منڈیوں، تعلیمی مرکزوں، کچہریوں، دفتروں اور اب سو برس سے زیادہ عرصہ ہورہا ہے کہ سیاسی تحریکات، سماجی کاموں، اسٹیشن اور ڈاک خانوں، ریلوں اور بسوں میں ان کو ایک دوسرے سے ملنے جلنے اور ایک دوسرے کو جاننے پہچاننے کے مواقع آسانی سے میسر ہیں۔

لیکن یہ دنیا کا حیرت انگیز واقعہ اور ایک طرح کی پہیلی ہے جس کا بوجھنا آسان نہیں کہ عام طور پر ایک کو دوسرے کے مذہبی عقائد، تہذیب ومعاشرت، طور طریق اور قومی خصوصیات سے قریب قریب اتنی بے گانگی اور اجنبیت ہے، جیسی پرانے زمانہ میں اکثر دو ملکوں کے باشندوں کے درمیان ہوا کرتی تھی، ہر ایک کی معلومات دوسرے کے متعلق ناقص، سطحی، سرسری اور زیادہ تر سنی سنائی باتوں اور قیاسات وتخیلات پر مبنی ہیں، ہر فرقہ دوسرے فرقہ کے بارے میں بہت سی شدید غلط فہمیوں میں مبتلا اور بعض اوقات منافرت انگیز لٹریچر، سیاسی پروپیگنڈے، زہر آلود اور رنگ آمیز تاریخ، نصاب کی کتابوں اور بے تحقیق داستانوں اور کہانیوں کی بنا پر اپنے ذہن ودماغ میں اس کی ایک غلط اور مکروہ تصویر قائم کیے ہوئے ہے، ایک فرقہ کے کٹر اور متعصب نہیں، نیک دل اور سادہ طبیعت افراد سے اگر دوسرے فرقہ کے بنیادی عقائد، مراسم اور معاشرت کے اصولوں کے متعلق دریافت کیا جائے تو وہ یا تو لاعلمی کا اظہار کریں گے یا ایسے جوابات دیں گے جن سے ایک واقف آدمی کو بے اختیار ہنسی آجائے گی۔ لیکن یہ ہنسی کی بات نہیں، رونے کا مقام ہے کہ سینکڑوں برس ساتھ رہنے کے باوجود ہم ایک دوسرے سے اتنے ناواقف ہیں، اس کی ذمہ داری تنہا ایک فرقہ پر نہیں، سب پر ہے اور خاص طور پر مذہبی، سماجی کام کرنے والوں، اپنے ملک سے سچی محبت رکھنے والوں اور انسانیت دوستوں پر ہے کہ انہوں نے ایک کو دوسرے سے صحیح طور پر واقف کرانے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی یا کی تو ناکافی۔

مہذب دنیا میں اب یہ اصول تسلیم کرلیا گیا ہے کہ محبت، احترام واعتماد اور امن وسکون کے ساتھ رہنے اور نیک مقاصد کے لیے ایک دوسرے سے تعاون اور اشتراکِ عمل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے متعلق صحیح معلومات حاصل کرنا ضروری ہے، آبادی کے ہر عنصر اور ملک کے ہر فرقہ اور ہر گروہ کن اصولوں پر عقیدہ رکھتا ہے، کن ضابطوں کا اپنے کو پابند اور ان کو اپنے لیے ضروری سمجھتا ہے، اس کی تہذیب ومعاشرت کا خاص رنگ کیا ہے؟ اس کو زندگی کی کون سی قدریں عزیز ہیں؟ اس کو قلبی سکون اور پُر اعتماد زندگی گزارنے کے لیے کیا چیزیں درکار ہیں؟ کون سے عقائد ومقاصد اس کو جان سے زیادہ عزیز اور اولاد سے زیادہ پیارے ہیں؟ ہمیں اس سے گفتگو کرنے میں، اس کے ساتھ خوشی اور مسرت کے ساتھ وقت گزارنے میں کن جذبات واحساسات کا لحاظ رکھنا چاہیے، بقائے باہم کے لیے (co-existence) (جو شائستہ اور پرسکون زندگی کا مانا ہوا اصول ہے) شرط اولین ہے کہ ضروری حد تک واقفیت حاصل ہو۔

ایک ایسے ملک کے لیے یہ اصول اور بھی ضروری قرار پاتا ہے جس کو اپنی رنگا رنگ تہذیب پر ناز اور ''جیو اور جینے دو'' کے زرّیں

اصول پر اس کا پرانا عقیدہ ہے، اس وقت ساری دنیا میں دور دراز ملکوں کے مذاہب اور فلسفوں، تہذیبوں اور معاشرتوں، زبانوں اور کلچروں، لہجوں اور محاوروں، یہاں تک کہ عادات واخلاق، شوق اور لت (Hobby) کھیلوں اور تفریحات، کھانوں اور لباسوں کی باریکیوں سے واقف ہونے کا عام رجحان پایا جاتا ہے، اس کے لیے یونیورسٹیوں میں مستقل مضامین داخل اور مستقل شعبے قائم ہیں، ایک ملک سے دوسرے ملک میں وفود جاتے ہیں، پروفیسروں اور طالب علموں کی ٹیمیں روز آتی جاتی ہیں، یہ بڑے غضب کی بات ہے کہ ایک ہی ملک کے باشندے سینکڑوں برس سے ساتھ رہنے سہنے کے باوجود ایک دوسرے سے اتنے بھی آشنا اور شناسا نہ ہوں، جتنے ایک ملک کے لوگ دوسرے ملک کے لوگوں سے ہوتے جا رہے ہیں۔

اس صورت حال کا نقصان ہندوؤں، مسلمانوں کو یکساں اور نتیجہ کے طور پر ہندوستان کو، بلکہ بالآخر انسانیت کو پہنچ رہا ہے، ملک کے فرقوں کے درمیان بڑی بڑی خلیجیں قائم ہیں، دلوں میں تلخیاں اور دماغوں میں شکوک ہیں، محبت والفت کے ساتھ رہنے، ہنسنے، بولنے، زندگی کا لطف اٹھانے اور ایک دوسرے پر اعتماد اور ایک دوسرے کی تہذیب اور مسلک کے احترام کی دولت سے (جو زندگی کا حسن ورونق اور خدا کی ایک بے بہا نعمت ہے) مجموعی طور پر یہ ملک محروم ہے اور اس کا نتیجہ ہے کہ بعض فرقوں اور (اس کے کہنے میں کوئی خوف اور حرج نہیں کہ) خاص طور پر مسلمانوں کی بہترین صلاحیتیں اور توانائی اپنی صفائی اور مدافعت اور اپنے مذہب، تہذیب اور زبان کی حفاظت میں صرف ہو رہی ہے اور ان کی وہ توانائیاں جو ان کو قدرتی طور پر ورثہ میں ملی ہیں اور جنہوں نے ماضی میں زندگی کے مختلف شعبوں میں اور فلسفہ وتصوف سے لے کر فن تعمیر اور فنون لطیفہ تک اور مملکت کے نظم ونسق سے لے کر خدمت خلق کے میدانوں تک، اپنے روشن اور لافانی نقوش چھوڑے ہیں، ابھی اس ملک کی تعمیر وترقی میں اور اس کے استحکام وآراستگی میں اس طرح صرف نہیں ہو رہی ہیں جیسی صرف ہونی چاہئیں، نفسیاتی طور پر اس کے لیے یہ اطمینان ضروری ہے کہ وہ صحیح طور پر سمجھے جاتے ہیں، ان کو خیالی اور بے جا حد تک نہیں، واقعی اور ضروری حد تک اعتماد اور احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، ان کے اور دوسرے فرقوں کے درمیان دبیز پردے پڑے ہوئے نہیں ہیں، ان کو شک وحقارت اور بے گانگی واجنبیت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا ہے، ایک ایسی نسل اور فرقہ کی طرح جو ایک ہزار برس سے ہمارے ساتھ دیوار بہ دیوار اور دوش بدوش رہ رہا ہے، ہم اس کے چہرے کے خط وخال سے واقف، اس کی خوبیوں اور کمزوریوں سے آگاہ اور اس کے ماضی وحال سے آشنا ہیں، ہمیں اس کے مذہبی عقائد کا بھی اتنا علم ہے، جتنا ان لوگوں کو ہوسکتا ہے جو ساتھ دینے پر نہیں لیکن ساتھ رہنے پر مجبور ہیں، ان کے رسم ورواج، ان کی تہذیب ومعاشرت، ان کے تقریبات وتہواروں اور ان کی خوشی وغمی سے ہماری واقفیت ایک یورپین سے زیادہ اور ایک ہم وطن اور ہم سفر کے شایان شان ہے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارے ملک کے بقاء، ترقی، عزت واستحکام اور اس کا معاصر دنیا اور اس خطرناک وپیچیدہ عالمی صورت حال میں اپنا شایان شان کردار ادا کرنے کے لیے صحیح، محفوظ، باعزت اور بے خطر راستہ وہی ہے جو تحریک آزادی کے مخلص دانشور اور بلند قامت وقیمت رہنماؤں پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا آزاد اور ان کے ساتھیوں نے تجویز کیا تھا اور وہ سچے سکولرزم، صحیح جمہوریت اور ہندو مسلم اتحاد کا راستہ ہے، خواہ وہ کتنا طویل اور مشکل ہو، اس کے علاوہ جو راستہ تجویز کیا جائے گا، اس سے خواہ عارضی ووقتی طور پر کامیابی حاصل ہو، ملک کے لیے تباہ کن اور ان قربانیوں پر پانی پھیرنے والا ہے جو جنگ آزادی میں عمل میں آئیں اور ملک کو ایسی مشکلات ومسائل سے دوچار کرنے والا ہے جن کا کوئی حل نہیں ہے۔

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

قیادت کی مطلوبہ صفات

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی

امت مسلمہ روئے زمین پر سب سے بہتر امت ہے، اس کے خمیر میں نیک سیرت کو قبول کرنے کی صلاحیت ہے اور وہ صراط مستقیم پر گامزن ہے، حق بات قبول کرنے کے لیے ہمہ وقت کوشاں ہے، عملی جذبہ سے معمور ہے، بھلائی کی طرف پکاری جانے والی ہر آواز پر لبیک کہنے والی ہے، خواہ وہ آواز مشرق و مغرب میں کسی کونہ سے دی جائے، بلاشبہ یہی وہ صفات ہیں جن کی بنیاد پر امت کا سواد اعظم سیدھے راستہ پر قائم ہے، ان ہی صفات کی بنیاد پر مسلم قائدین کے لیے تاریخ میں بارہا ایسا ممکن ہوا ہے کہ انہوں نے برف کے تودے پگھلا دیے ہیں اور پوری مہارت و کامیابی کے ساتھ زمانہ کے حالات کو درست کیا ہے، تاریخ اسلام کے مختلف ادوار میں ایسے اصحاب ایمان پیدا ہوتے رہے ہیں جنھوں نے بگاڑ و فساد کا مقابلہ کیا ہے اور اس کے نتیجہ میں غیر معمولی خرق عادت واقعات پیش آئے ہیں، انہوں نے حالات کا دھارا موڑ دیا، معاشرتی طرز تبدیل کر دیا اور اگر ان کا مقابلہ کسی دشمن سے ہوا تو انہوں نے اس کو شکست کھانے پر مجبور کر دیا، مگر یہ سب تب ہی ممکن ہوا جب امت مسلمہ کو اس کی شایان شان قائدین نصیب ہوئے، ایسے قائدین جو بیک وقت اخلاص، ایمان اور حکمت کے اوصاف سے متصف تھے۔

واضح رہے کہ ایسے قائدین روایتی تعلیمی اداروں یا عوامی اسلامی معاشروں سے تیار ہو کر کبھی نہیں نکلے، بلکہ ان کی شخصیت کے اصل تشکیلی عناصر قرآن و سنت سے کشید کیے ہوئے نبوی تربیت کے وہ وسائل ہیں جو براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں اور ان وسائل میں تاثیر ایسے مربیین و مخلصین کی صحبت سے پیدا ہوتی ہے جن کو اسی فرض منصبی کے لیے اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے خاص توجہات حاصل ہوتی ہیں۔

ایک کمزور و ناتواں اور منتشر و پارہ پارہ امت مسلمہ میں بدرجہ اتم یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ ایک مضبوط و توانا اور متحد امت کی مثال پیش کر سکے، لیکن شرط یہ ہے کہ اس کے قائدین اخلاص و ایمان اور عملی میدان میں حکمت کے اوصاف سے لیس ہوں، تاریخ اسلامی میں ایسی قدر آور مسلم قیادتوں کی مختلف میدانوں میں بیش بہا مثالیں موجود ہیں، خواہ وہ میدان سیاسی ہو یا دعوتی و تربیتی ہو۔

امت مسلمہ اس بات کی متقاضی ہے کہ اس کے اندر شمع ایمانی کو فروزاں کیا جائے، جذبہ دینی کو بیدار کیا جائے اور اس کی صفوں کو متحد کیا جائے لیکن اس کے لیے ایسے رہنماؤں اور قائدین کی ضرورت ہے جن کے پاس تیل بتی کا سامان موجود ہو، اس قندیل کو روشن کرنے کا سب سے زیادہ تیر بہدف نسخہ امت میں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان کی روح پھونکنا اور اس کا رخ رضائے الٰہی کے حصول کی طرف موڑنا ہے، جس کا غیر معمولی اجر و ثواب آخرت میں ملنے والا ہے۔

یہ ایمان کی ہی کرشمہ سازیاں ہیں جس نے اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں امت مسلمہ کو عظیم الشان تاریخی کارناموں کی انجام دہی پر آمادہ کیا، اس نے دنیا کو بیش قیمت علمی سوغات پیش کیں، تخریبی طاقتوں کو انسانیت کا سبق سکھایا اور دنیا کے مختلف خطوں میں جنگی مہموں کو بھی سر کیا، لہٰذا بلا مبالغہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ انسانی زندگی کے جس رزم گاہ کی طرف مسلمانوں کا روئے سخن ہوا اس میں وہ سب پر بازی لے گئے اور حیرت انگیز کارنامے انجام دیے، لیکن یہ سب تب ہی ممکن ہوا جب ایمان و فراست سے متصف قیادت کی سرپرستی انہیں حاصل تھی، ایسی کئی نظیریں ہمارے سامنے موجود ہیں کہ مسلمانوں نے اعلیٰ قیادتوں کی بنیاد پر ایک تاریخ رقم کی ہے، طارق بن زیاد کی زیر قیادت اندلس کی فتح، محمد الفاتح کی زیر امارت قسطنطنیہ کی بازیابی اس کی زرّیں مثالیں ہیں، اسی طرح حضرت عمر بن خطابؓ کی سیاسی سوجھ بوجھ کے فیصلے اور لوگوں پر انصاف کے ساتھ حکومت کا ذکر ہو یا حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا سیاسی اخلاقیات

کی اصلاح اور روحانی اقدار کے احیاء کا تذکرہ ہو، یا پھر سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کا مسلمانوں کی صفوں کو متحد کرنے کا کارنامہ ہو، جنہوں نے امت کو ایسے وقت میں سہارا دیا جب کہ اس کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا اور تاروپود بکھر چکے تھے، انہوں نے مسلمانوں کو سرخ رو کیا اور تقریباً ایک صدی پر محیط ذلت وادبار کی داستان کے بعد مسلمانوں کا سر فخر سے اونچا کر دکھایا۔

حاصل بحث یہ کہ مسئلہ نفس امت مسلمہ کا نہیں ہے، الحمدللہ وہ اپنی جگہ سو فیصد ٹھیک ہے اور ابھی وہ مطلوبہ ذمہ داری کے فریضہ کا بار اٹھانے کی پوری طرح اہل ہے، لیکن اسے ایسے قائدین کی تلاش ہے جو پورے اخلاص اور امانت و دیانت داری کے ساتھ اس ذمہ داری کا بوجھ اٹھا سکیں اور اس کو نبھا سکیں، ظاہر ہے ایسے قائدین اسی امت سے نکل کر سامنے آئیں گے، اس لیے ملت کے جانبازوں کے پاس یہ ایک سنہرا موقع ہے کہ وہ خود کو اس اہم فرض منصبی کے لیے کمربستہ کریں اور خود کو ایمان واخلاص اور دیگر صفات حسنہ کے زیور سے آراستہ کریں جو اس فرض منصبی کی شرط ہے۔

مسلمانوں پر اللہ کا خاص فضل وکرم رہا ہے کہ ان کی تاریخ میں کوئی صدی یا کوئی دور ایسا نہیں گزرا جس میں تجدیدی شان کے حامل افراد پیدا نہ ہوئے ہوں، ان میں قیادت کی تمام مطلوبہ صفات بحسن وخوبی موجود تھیں، جس کی بنیاد پر وہ باطل کے لیے تیغ براں ثابت ہوئے اور امت کے مسیحا بنے کہ اس کو قعر مذلت سے نکال کر عز وشرف کی انتہائی بلندیاں عطا کیں اور منحرف وگمراہ کن راستوں سے بچا کر راہ ہدایت اور صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کی۔

موجودہ حالات کے پیش نظر کیا عجب ہے کہ آج بھی امت مسلمہ کا کوئی سپوت اٹھ کھڑا ہو جو اس فرض کو انجام دے اور اس کی جانفشانیوں سے یہ امت باعزت ہو اور اس کا کھویا ہوا نام ومقام اس کو واپس مل جائے، حتی کہ ذلت وپسماندگی کا کوئی داغ اس کی پیشانی پر باقی نہ رہے، خواہ وہ فلسطین ہو یا دنیا کا کوئی دوسرا خطہ اور نہ ہی کوئی ایسا اخلاقی یا سماجی مرض باقی رہے جو امت مسلمہ کی معنویت کو دیمک کی طرح چاٹ جاتا ہے اور اللہ کی رحمت کے حصول میں آڑ بن جاتا ہے، اس لیے کہ اللہ کی رحمت انہی سے قریب تر ہے جو حسن عمل کا پیکر مجسم ہیں۔

بلاشبہ اس وقت امت مسلمہ ایک بار پھر سیاسی ومعاشرتی زوال کا شکار ہے اور وہ بڑی شدت سے ایک ایسی ہستی کی منتظر ہے جو اس کی نشاۃ ثانیہ کے لیے سعی کرے، اس کے شیرازہ کو متحد کرے، اقوام عالم میں اس کے قد کو اونچا کرے، اپنی فراست ایمانی اور حکمت اسلامی کے ذریعہ اس کی معاون ہو اور اس کا عزم وحوصلہ صلاح الدین ایوبیؒ کے حوصلہ کی مانند ہو، یقیناً ایک ایسی ہی تجدیدی شان کی حامل شخصیت امت مسلمہ کو قیادت وامامت کا وہ منصب عطا کر سکتی ہے جو اس کا حق ہے اور وہ اس کے لیے بہر صورت اہل بھی ہے، ظاہر ہے یہ سب اللہ کی ذات کے لیے ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔

بقیہ: اداریہ

مسئلہ صرف مسلمانوں کا نہیں، مسئلہ پورے ملک کا ہے، پوری انسانیت کا ہے، انسانوں کی انسانیت داؤ پر لگی ہوئی ہے، اس کی فکر اگر نہ کی گئی تو ہر چیز خطرہ میں ہے، بڑی خوش فہمی میں مبتلا ہیں وہ لوگ جو سمجھتے ہیں کہ کشتی میں سوراخ کر کے وہ خود محفوظ رہیں گے، واقعہ یہ ہے کہ ملک کی کشتی میں جگہ جگہ دراڑیں پیدا کی جا رہی ہیں، اگر ان کو پاٹنے کی بھرپور کوششیں نہ کی گئیں تو نہ دراڑیں پیدا کرنے والے بچیں گے اور نہ وہ لوگ بچیں گے جو چین کی نیند سو رہے ہیں، اپنے اپنے کاموں میں مگن ہیں، انجام کی ان کو کچھ خبر نہیں۔

ان حالات میں سب سے بڑی ذمہ داری مسلمانوں کی ہے، وہ ایمان واخلاق کی قندیلیں روشن کریں، لوگوں کو خبردار کریں اور خود اپنے بچاؤ کا بھی انتظام کریں اور ملک کی ڈوبتی کشتی کو بھی پار لگائیں۔

اولو العزمان دانش مند جب کرنے پہ آتے ہیں
سمندر پاٹتے ہیں کوہ سے دریا بہاتے ہیں

ذرائع ابلاغ کی تاثیر وقوت

مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی

یہ دور جس میں ہم اور آپ جی رہے ہیں ''انفارمیشن ٹکنالوجی'' کا دور ہے، ذرائع ابلاغ کی تاثیر وقوت کا ہم سب کو اعتراف ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس وقت اسی کی حکمرانی ہے اور ذہن سازی کا اس وقت وہی سب سے بڑا ذریعہ ہے تو غلط نہ ہوگا، تعلیم کی اہمیت وافادیت اور اس کی اثر انگیزی سے کسی کو انکار نہیں، لیکن اس کا دائرہ محدود ہے، وہ کتاب، استاد اور درس گاہ تک ہی محدود ہے، ذرائع ابلاغ میں جو تنوع ہے، لوگوں کی دلچسپیوں کا اس میں جتنا خیال ہے اور اس کی پہنچ کا دائرہ جتنا وسیع ہے اور پھر جتنی کم قیمت پر وہ دستیاب ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ اس دور میں دفاع اور تعلیم سے زیادہ زور ذرائع ابلاغ پر دیا جارہا ہے۔

یورپ نے عالم اسلام پر اپنا سیاسی، تہذیبی، ثقافتی اور فکری اثر واقتدار قائم کرنے میں ذرائع ابلاغ کا سب سے زیادہ سہارا لیا، اس مقصد کے حصول کے لیے عیسائی مبلغین اور مستشرقین نے تعلیم یافتہ طبقہ کو اپنا ہم خیال بنانے اور عالم اسلام کی رائے عامہ کو ہموار کرنے کی خاطر اخبارات ورسائل کا اجراء کیا، ان میں سے بعض کے اپنے ریڈیو اسٹیشن ہیں اور متعدد ٹی وی چینل، اخبارات ورسائل کی تو کوئی انتہا نہیں ہے، اسلامی موضوعات پر انہوں نے کتب خانے کے کتب خانے قائم کردیے جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف لوگوں کے ذہن بناتے رہتے ہیں اور ان کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت پیدا کرتے رہتے ہیں۔

یہودیوں نے صحافت کی اہمیت کا احساس انیسویں صدی کے آخر میں ہی کرلیا تھا اور اس کے لیے انہوں نے اقدامات شروع کردیے، جن کے نتائج اب ظاہر ہورہے ہیں۔ ۱۸۶۹ء میں یہودی حاخام ''راشورون'' نے پراگ میں میڈیا پر کنٹرول حاصل کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا: ''دنیا پر کنٹرول کرنے کے لیے اگر سونے کے ذخائر پر قبضہ ہماری پہلی ترجیح ہے تو ذرائع ابلاغ کا استعمال دوسری۔''

شروع میں ان کے لیے اخبار نکالنا مشکل تھا تو انھوں نے اخبارات کو اشتہارات دے کر اپنا دباؤ اخبار کے مالکان اور ایڈیٹرس پر بنایا اور خبروں کو اپنے مطابق شائع کرنے پر زور دیا، پھر جب بعد میں وہ اخبارات نکالنے کی پوزیشن میں آئے تو خود اخبارات کے مالک بن گئے۔

شروع میں ہم مسلمانوں کو صحافت کی اہمیت وافادیت کا صحیح اندازہ نہ ہوسکا اور ہم نے اس کی طرف وہ توجہ نہیں کی جو کرنی چاہیے تھی، جب کہ یورپ نے پندرہویں صدی عیسوی میں پریس کے وجود آنے کے فوراً بعد ہی ذرائع ابلاغ کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کرنا شروع کردیا تھا اور خود عالم اسلام میں عیسائی مبلغین اور مستشرقین نے اس کا بھرپور استعمال کیا، لیکن ہم مسلمانوں نے اس پر توجہ نہیں کی، اہل یورپ میں اسلام کے تعلق سے جو معاندانہ رویہ پایا جاتا ہے، وہ ان وسائل ابلاغ کے معاندانہ استعمال کی دین ہے۔

یورپ نے صلیبی جنگوں میں شکست سے دوچار ہونے کے بعد اپنی پالیسی تبدیل کردی تھی اور عسکری جنگ کا راستہ چھوڑ کر فکری، ثقافتی اور علمی جنگ کا راستہ اختیار کیا اور اس راہ سے اس نے وہ مقاصد حاصل کیے جو وہ دو سو سال کی صلیبی جنگوں کے بعد بھی حاصل نہیں کرسکا تھا، اس کا اعتراف خود مستشرقین نے بھی اپنی کتابوں میں کیا ہے، ہم مسلمانوں کو صحیح وقت پر اس کا اندازہ نہ ہوسکا، جس کا خمیازہ انہیں آج بھگتنا پڑرہا ہے، فکر اور میڈیا کے میدان میں کوتاہی وکمزوری کی وجہ سے آج ہم مسلمان نت نئے مسائل اور آزمائشوں سے دوچار ہیں اور مظلوم ہوتے ہوئے بھی دنیا کی نظروں میں ظالم بنے ہوئے ہیں، ادھر کچھ عرصہ سے ذرائع ابلاغ کی طرف ہماری توجہ ہے اور اس کے لیے کوششیں بھی جاری ہیں اور اس کے نتائج بھی سامنے آرہے ہیں، لیکن ہماری یہ کوششیں تمام تر وسائل رکھنے کے باوجود بھی نہ منظم ہیں اور نہ معیاری، ضرورت ہے کہ ہمارے سرمایہ دار حضرات اس میدان میں قدم رکھیں تاکہ دنیا کے سامنے سچ اور حقیقت آسکے۔

مسلسل

سچائی کیا ہے؟

بلال عبدالحی حسنی ندوی

دو بنیادی اوصاف کا فقدان:

حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ حضرت مولانا علی میاںؒ کے شیخ تھے، وہ عجیب وغریب بات فرماتے تھے جس کو میں اکثر سناتا ہوں، فرماتے تھے کہ اس وقت دنیا میں جو کچھ بھی انتشار اور بگاڑ ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ اخلاص نہیں اور اخلاق نہیں، ہر جگہ آپس کے جھگڑے لڑائیاں ہیں، کرسی کا جھگڑا ہے، منصب کا جھگڑا ہے اور دین کی بہت ساری شکلیں ہیں، دین کو بنیاد بنا کر جھگڑے ہیں، ان کا بنیادی سبب یہ ہے کہ کام کرنے والے کے اندر اخلاص نہیں ہے، اور دوسرا سبب یہ ہے کہ اخلاق کی بلندی نہیں، اور فرماتے تھے کہ اخلاص اور اخلاق حاصل کرنے کا جو راستہ ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ کی محبت پیدا کی جائے، جب اللہ کی محبت پیدا ہوگی تو آدمی جو کرے گا وہ اللہ کے لیے کرے گا، اور اللہ کے بندوں سے بھی اس کو محبت ہوگی، اور وہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرے گا، اخلاق کا برتاؤ کرے گا۔ حضرت شیخ پھر فرماتے تھے کہ اس کو پیدا کرنے کا جو ذریعہ ہے، وہ یہ ہے کہ کثرت سے اللہ کا ذکر کیا جائے اور اللہ والوں کی صحبت اختیار کی جائے۔ صحبت کے بغیر کام نہیں ہوتا، تنہا ذکر بھی کافی نہیں، اللہ کے نبی ﷺ کو اللہ نے کیوں بھیجا؟ یہ بھی ممکن تھا کہ کتاب اتار دی جاتی، قرآن مجید دے دیا جاتا کہ عمل کرلو، لیکن نہیں! اللہ نے انسان کا مزاج ایسا بنایا ہے کہ جب وہ کسی کو دیکھتا ہے تو اس کے اندر ایک رنگ پیدا ہوتا ہے، اور وہ چیز اپنی پوری گہرائی کے ساتھ اترتی ہے، وہ اسی وقت اترتی ہے جب وہ کسی کو دیکھتا ہے کہ وہ کس طرح زندگی گذار رہا ہے؟ وہ کس طرح عمل کر رہا ہے؟ اس عمل سے اس کے اندر عمل کی شان پیدا ہوتی ہے۔ صحبت کے بغیر اصلاح نہیں ہوتی، فساد و بگاڑ بھی اسی سے ہے اور اصلاح بھی اسی سے ہے، اچھی صحبت میں آدمی ہے تو کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے اور اگر بری صحبت میں چلا جائے تو پھر خطرہ میں ہے، پھر اس کا سنبھالنا مشکل ہوتا ہے۔

صحبت کی اہمیت:

صحبت کی اہمیت کو اس آیت شریفہ سے سمجھا جاسکتا ہے، جس میں اللہ تبارک وتعالیٰ اس کا حکم دے رہا ہے کہ اے ایمان والو! اللہ کا ڈر پیدا کرو، لحاظ پیدا کرو اور سچوں کے ساتھ وقت گذارو، سچوں کے ساتھ رہو، "كُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ" ظاہر ہے جب آدمی سچوں کے ساتھ رہے گا تو سچائی کی صفت پیدا ہوگی اور جھوٹوں کے ساتھ رہے گا تو جھوٹ پیدا ہوگا، صرف دین کا مظاہرہ تنہا کافی نہیں ہے۔

اس سے اندازہ ہوا کہ اصل میں دین کی حقیقت ضروری ہے، اور اندرو باہر کی یکسانیت ضروری ہے، اور زبان کی سچائی ضروری ہے اور اس کے ساتھ عمل کی سچائی ضروری ہے، جب یہ باتیں ہوں گی تو آدمی کی زندگی کا ایک نیا رخ ہوگا، ورنہ اگر وہ کسی ایسے کے ساتھ رہے جو صرف مظاہرہ کرنے والا ہے، تو پھر اس کے اندر بھی مظاہرہ کی صفت پیدا ہوگی، حقیقت دین اس کے اندر نہیں آئے گی، اسی لیے یہ حکم بھی ہے کہ اگر آدمی کسی کے ساتھ رہنا چاہتا ہے، کسی کی صحبت میں وقت گذارنا چاہتا ہے تو اس کو چاہیے کہ پہلے وہ اس کو پرکھ لے اور دیکھ لے کہ اس کی زندگی کیسی ہے؟ سنتوں پر عمل ہے یا نہیں؟ اور سنتیں بھی صرف ظاہری سنتیں نہیں جن کو دنیا سنت سمجھتی ہے، وہ تو سنتیں ہیں ہی، اس سے آگے بڑھ کر یہ کہ اس کی پوری زندگی اللہ کے نبی ﷺ کی زندگی کا عکس ہو، کیونکہ اس وقت تک آدمی کامل نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ پوری زندگی کو آپ ﷺ کی

زندگی کا عکس نہ بنالے۔

سنتیں مختلف ہیں، معاملات کی سنتیں ہیں، لوگوں سے روابط کیسے ہونے چاہئیں، اس کی سنت کیا ہے؟ اخلاق کیسے ہونا چاہئیں؟ یوں تو ظاہر میں بڑی دینداری آگئی، لیکن مزاج کی خشکی پیدا ہوگئی تو یہ آپ ﷺ کی سنت سے ہٹی ہوئی بات ہے، اخلاق بھی بلند ہونا چاہئیں اور اخلاق کی بلندی کے ساتھ سچائی ہونی چاہیے، یہ ساری باتیں آدمی پرکھ لے اور پرکھنے میں بھی سب سے زیادہ آسان راستہ یہ ہے کہ وہ دیکھ لے کہ یہ جھوٹ تو نہیں بولتا، اس لیے کہ عام طور پر جہاں پانی مر رہا ہوتا ہے وہ اسی راستہ سے پانی مرتا ہے، آدمی کی زبان قابو میں نہیں رہتی، وہ کہیں نہ کہیں جھوٹ بولتا ہے اور زیادہ تر اپنی بڑائی جتلانے کے لیے آدمی جھوٹ بولتا ہے، کچھ مبالغہ کے ساتھ ایسی چیزیں بیان کی جاتی ہیں، جس سے بزرگی کا مظاہرہ ہو، یہ ساری چیزیں وہ ہیں جو دین کے مزاج سے ہٹی ہوئی ہیں، آپ ﷺ کو پسند نہیں اور قرآن مجید میں بھی صاف صاف یہ بات کہہ دی گئی ہے کہ سچوں کے ساتھ رہو۔

تقوی کی زندگی:

یہاں ایک بات اور واضح ہوتی ہے، وہ یہ کہ ایمان سب سے پہلا مرحلہ ہے اور اس کے بعد تقوی ہے، اگر آدمی تقوی کی زندگی اختیار کرنا چاہتا ہے تو اس کا راستہ یہ ہے کہ سچوں کے ساتھ وقت گذارا جائے، تب تقوی کا مزاج بنے گا۔

تقوی کا مسئلہ کیا ہے؟ اس میں بھی لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں، لوگ کہتے ہیں کہ فلاں بڑا متقی ہے، جس کا مطلب ہوتا ہے کہ فلاں بہت نمازیں پڑھتا ہے، کوئی کہتا ہے کہ فلاں کے ماشاء ڈاڑھی بھی ہے، ٹوپی بھی لگاتا ہے، کرتا پائجامہ پہنتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ بس یہی کافی ہے، ہمارے معاشرہ میں اسی کو کہا جاتا ہے کہ وہ بڑا متقی ہے۔

یقیناً یہ چیزیں بڑی مبارک ہیں، اس میں کوئی شبہ نہیں، دین کے اعلیٰ ترین مظاہر ہیں، لیکن یہ تقوی کے لیے کافی نہیں ہیں، تقوی احتیاط کی زندگی کو کہتے ہیں، یعنی آدمی ہر عمل میں پہلے یہ سوچے کہ یہ اللہ کو راضی کرنے والا عمل ہے یا ناراض کرنے والا عمل ہے؟ اگر یہ مزاج پیدا ہوجائے تو یہ تقوی کا مزاج ہے، آدمی ہر کام کرنے سے پہلے سوچے کہ کہیں ہمیں یہ عمل نقصان تو نہیں پہنچائے گا، اس کے نتیجہ میں ایسا تو نہیں ہوگا کہ اللہ ناراض ہوجائے گا۔ یہ مزاج بن جائے تو یہ تقوی کا مزاج ہے، ہر عمل سے پہلے گویا ایک تھرمامیٹر ہو جو ناپ کر بتادے کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے؟ اللہ کو راضی کرنے والا عمل کون سا ہے اور اللہ کو ناراض کرنے والا عمل کون سا ہے؟ ہر عمل سے پہلے جب یہ سوچنے کا مزاج پیدا ہوجائے اور اس کا لحاظ آدمی کے اندر آجائے تو پھر یہ اصل تقوی ہے۔

ظاہر ہے یہ تب ہی ہوتا ہے جب اللہ کا دھیان پیدا ہوتا ہے، جب آدمی کو اللہ کا ایسا دھیان پیدا ہوگا کہ وہ سوچے گا کہ ہر وقت اللہ سامنے ہے اور اللہ اس کو دیکھ رہا ہے، تو ظاہر ہے کیا کوئی کام وہ اللہ کی رضا سے ہٹ کر کرسکتا ہے؟ وہ جو کام کرے گا، یہ سوچ کر کرے گا کہ اللہ نہ ناراض ہوجائے اور حقیقت میں یہی تقوی کی زندگی ہے۔

تقوی کی یہ زندگی سچوں کے ساتھ رہ کر پیدا ہوتی ہے۔ سچے کون ہوتے ہیں؟ سچے اعلیٰ درجہ کے متقین ہوتے ہیں، ان کے یہاں سچائی ہوتی ہے، ان کے یہاں ایسی کوئی چیز نہیں ہوتی جو حقیقت سے ہٹ کر ہو، ایسے لوگوں کی زندگی نمونے کی زندگی ہوتی ہے، آدمی جب ان کے ساتھ وقت گذارتا ہے تو ان کی خشیت کو دیکھتا ہے، ان کے تقوی اور اللہ کے ڈر کو دیکھتا ہے، ان کی پاکیزہ زندگی کو دیکھتا ہے، ان کی احتیاط کو دیکھتا ہے، پھر اس کے اندر اس کا اثر پڑتا ہے، باریک سے باریک باتیں جب اس کی زندگی میں اس کو نظر آتی ہیں تو یہ سمجھتا ہے کہ یہ باتیں بھی ایسی ہیں کہ ان کا لحاظ کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن جب بڑی بڑی خندقیں ہوتی ہیں تو آدمی کبھی نہیں سمجھ سکتا کہ کیا صحیح ہے کیا غلط؟ کیا لینا چاہیے اور کیا چھوڑنا چاہیے؟ حاصل بحث یہ کہ جب انسان سچوں کے ساتھ زندگی گذارے گا تو تقوی کا مزاج بنے گا۔

نسبتوں کی حقیقت

عبدالسبحان ناخدا ندوی

اللہ کے فضل وانعام کو اپنا ''ذاتی وموروثی حق'' سمجھنے کی بیماری جب جڑ پکڑتی ہے تو شکر الٰہی کا جذبہ فنا ہو جاتا ہے اور اللہ سے نسبت رکھنے والی چیز سے محبت محض اس وجہ سے ہوتی ہے کہ یہ ''ہماری'' ہے، گویا محبت کی بنیاد اللہ کی ذات نہیں بلکہ خالص نفسانیت بن جاتی ہے، یہ بڑا خطرناک روگ ہے، جو دین کے پردے میں چھپ کر آتا ہے، یہود کو توریت اور حضرت موسی سے محبت اس لیے نہیں تھی کہ یہ اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسول ہیں، بلکہ اس لیے محبت تھی کہ یہ ہمارے نبی اور ہم پر اتری ہوئی کتاب ہے، اس غلط محبت کا انجام یہ ہوا کہ جب اللہ نے آخری نبی کو مبعوث فرمایا اور اپنی آخری کتاب اتاری تو یہ بدک گئے اور اللہ کی کتاب ہونے کے باوجود اس سے اعراض کیا اور حوالہ یہی دیا کہ ہم تو بس اسی کو مانیں گے جو ہم پر اتری ہے، گویا مرکز محبت اللہ کی ذات نہیں رہی بلکہ اپنی خاص نسبت ہوئی، ایسی محبت بھلے وہ کتاب الٰہی یا رسول الٰہی کے حوالہ ہی سے کیوں نہ ہو، اللہ کے نزدیک ہرگز قابل قبول نہیں ہے۔

اس زمانہ میں جو وسائل کو مقاصد پر ترجیح دینے کا مزاج پایا جاتا ہے، وہ بھی اس یہودی مزاج سے ملتا جلتا ہے، کوئی اللہ کا بندہ دین کی سچی خدمت کر رہا ہو اور ہم صرف اس وجہ سے اس شخص سے دوری رکھیں کہ وہ ہمارے خاص طرز کو نہیں اپناتا ہے، اس کا نام محبت دین یا حب اللہ ہرگز نہیں، اسی طرح کوئی محض ہمارے طرز پر ہے لیکن مقاصد دین سے دور رہے تو ہمارا اس سے محبت رکھنا بھی ایک لحاظ سے ''نسبت'' کو حقیقت پر ترجیح دینا ہے، یہود کو اپنی نسبتیں (حالانکہ اس میں بھی وہ سچے نہیں تھے) اس قدر عزیز تھیں کہ اس کے مقابلہ پر اللہ سے سچی محبت کو بھی انہوں نے قربان کر دیا اور یہ سمجھ بیٹھے کہ ان ہی نسبتوں کے سہارے وہ اللہ کی جنت جیت لیں گے، لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اصل ہدایت سے محروم ہو کر دنیا وآخرت دونوں میں برباد ہوئے، نصاری بھی ان ہی کی دیکھا دیکھی نسبتوں کے اسیر بن گئے، حقیقت نہ ان کو ملی نہ ان کو۔

اللہ کا دین غیر مشروط محبت اور اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے، مرکز محبت اللہ کی ذات ہو نہ کہ کسی کی خاص نسبت، اسی لیے قرآن مجید میں حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کا واقعہ بیان کیا گیا کہ اصل مقصود اللہ کے لیے سب کچھ تج دینا ہے، اسی لیے ان دونوں حضرات کی نمایاں صفت ''الاسلام'' کو انتہائی نمایاں کر کے دکھایا گیا ہے، پھر بنی اسرائیل کے جد امجد حضرت یعقوب کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے کہ ان کی اصل وصیت ''الاسلام'' پر قائم ودائم رہنے کی تھی، کسی خاص نسبت کو قائم رکھنے کی ہرگز نہیں تھی، پھر تمام نسبتوں اور حقیقتوں کا لب لباب اس آیت میں مزید واضح کیا گیا ہے:

﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَنَحْنُ لَهُ عَابِدُونَ﴾ (صرف اللہ کے رنگ میں رنگ جاؤ اور اللہ سے بہتر کس کا رنگ ہو سکتا ہے اور ہم تو بس اسی کی غلامی کرتے ہیں)

اور ایک دوسری جگہ اہل اسلام کی تعریف ایک خاص وصف سے کر کے یہ پیغام دیا گیا ہے کہ اس سے وہ بال برابر بھی نہ ہٹیں، وہ وصف ہے:

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ﴾ (ایمان والے تو اللہ سے بے پناہ محبت رکھتے ہیں)

یہود ونصاری ظاہر داری کے چکر میں اس عزیز از جان متاع کو گم کر بیٹھے اور مشرکین مکہ کو دیوی دیوتا اپنی جنت میں داب لے گئے، اللہ سے محبت نہ ان کے حصہ میں آئی نہ ان کے حصہ میں، ان تمام امور کو پیش نظر رکھ کر آئندہ سطور کا مطالعہ کریں، ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَقَفَّيْنَا مِن بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ أَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَى أَنفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيقًا

كَذَّبْتُمْ وَفَرِيقاً تَقْتُلُونَ﴾(البقرة: ۸۷)

(اور بالتحقیق ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی اور ان کے بعد کئی رسولوں کو ان کے پیچھے بھیجا اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو کھلی نشانیاں دیں اور روح القدس کے ذریعہ ان کو طاقت بخشی، تو کیا ایسا نہیں ہوا جب بھی کوئی رسول تمہارے پاس ایسی بات لے کر آتا جو تمہاری خواہش کے مطابق نہیں تھی تو تم نے تکبر کیا، اس طرح ایک جماعت کو تم نے جھٹلا دیا اور ایک جماعت کو تم قتل کرتے رہے)

اس کا تعلق موجودہ یہودیوں سے ہے، اور ضمناً ان کے آباء و اجداد کا بھی تذکرہ ہے، جب کہ اس سے قبل کی آیات میں ان کے آباء واجداد کی نافرمانیاں بیان کی گئی ہیں اور وہاں ضمناً موجودہ یہود کا بھی تذکرہ ہے۔ اس باب کے آغاز میں حضرت موسیٰ و حضرت عیسیٰ کا تذکرہ ہے، تاکہ پورا احاطہ ہو اور یہ بتایا جائے کہ حضرت موسیٰ سے لے کر بنی اسرائیل کے آخری نبی حضرت عیسیٰ تک تمہارا کیا رویہ رہا، حقیقت میں موجودہ یہود پر یہ فرد جرم عائد کی جارہی ہے کہ تم جو توریت اور اسرائیلی پیغمبروں کا حوالہ دے کر اس دین کا انکار کر رہے ہو اور محمد ﷺ کی تکذیب کر رہے ہو، اس میں تم دہرے مجرم ہو، ایک یہ کہ اللہ کا دین ہمیشہ ایک ہی رہا ہے، اللہ کی سابقہ شریعت کا حوالہ دے کر موجودہ شریعت کو ٹھکرانا خدا پرستی نہیں بلکہ بددیانتی ہے، اسی طرح اللہ کی سابقہ کتاب کا واسطہ دے کر موجودہ کتاب کی تکذیب کرنا خود اللہ کی شان میں گستاخی کرنا ہے۔ دوسرا جرم یہ ہے کہ جن انبیاء کرام کے حوالے سے تم حضرت محمد ﷺ کو جھٹلا رہے ہو اور جس توریت کا نام لے لے کر تم قرآن کریم کا انکار کیے جا رہے ہو، ان سب کے ساتھ کیا تمہارا واقعی وہ رویہ رہا ہے جس کا تم دعوی رکھتے ہو؟ انبیاء کے قتل و تکذیب سے تمہاری تاریخ بھری پڑی ہے، توریت کے ساتھ تم نے جو حشر کیا ہے وہ اظہر من الشمس ہے، پھر کس منہ سے تم یہ بات کہہ رہے ہو؟

دین و شریعت سے محبت فنائیت کا جذبہ پیدا کرتی ہے، پھر اس کے لیے بڑی سی بڑی قربانی پیش کرنا آسان ہو جاتا ہے، دوسری طرف ایک اور جذبہ ہے جس میں انسان اپنے آپ کو مقام ناز پر فائز سمجھ کر دین کو اپنا خادم بنانے کی کوشش کرتا ہے، لہٰذا وہ دین کو قتل کر کے بھی اپنے آپ کو شریعت کا ٹھیکیدار سمجھتا ہے، یہود جھوٹ موٹ اپنے آپ کو اسی مقام پر سمجھتے تھے، اس کا طبعی نتیجہ یہی نکلنا تھا جو قرآن کریم نے بیان کیا ہے کہ جب بھی ان کی خواہشات سے ٹکرانے والی کوئی چیز لے کر حضرات انبیاء آتے تو یہ ان کو قتل کرنے سے بھی دریغ نہ کرتے، جھٹلانا تو ان کے نزدیک ایک معمولی کام بن گیا تھا، حقیقت میں تمناؤں اور آرزؤں کی دنیا انسان کو بہت دور لے جا کر مارتی ہے، یہ تمنائیں صداقت و حقیقت کا ایک وار بھی سہہ نہیں پاتیں، قرآن کریم نے جب اصل حقائق ان کی نگاہوں کے سامنے پیش کیے تو یہود ان کو برداشت نہ کر سکے اور اسے سچائی کے ساتھ قبول کرنے کے بجائے پھر ان ہی تمناؤں کے آغوش میں چلے گئے جنھوں نے صدیوں تک ان کو غفلت کی نیند میں مارے رکھا تھا، ان کا یہ مرض اس قدر لاعلاج بن چکا تھا کہ خود قرآن کو یہ اعلان کرنا پڑا:

﴿بَل لَّعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ﴾ (بلکہ اللہ نے ان کے کفر کی پاداش میں ان پر پھٹکار برسائی ہے، اس لیے یہ لوگ بس برائے نام ایمان رکھتے ہیں)

اہل ایمان کے لیے ان آیات میں یہ پیغام ہے کہ دین کو ہمیشہ "مطلوب" بنائیں، یہ راستہ محبت خداوندی تک پہنچاتا ہے، ورنہ اللہ کا قانون بے لاگ ہے، وہ جس طرح کل تھا آج بھی ویسا ہی ہے۔

اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھنے کے لیے "اِسْتَكْبَرْتُمْ" کا لفظ استعمال ہوتا ہے، جو اس موقع پر یہود کے لیے قرآن میں استعمال ہوا ہے۔ خواہشات کے خلاف حضرات انبیاء بھی کوئی پیغام پیش کرتے تو ان کی اکڑ میں اور اضافہ ہوتا کہ ہم سے ایسی باتوں کا مطالبہ ہو رہا ہے، جب کہ ہمارا مقام ان احکامات سے بہت بلند ہے، اللہ رب العزت کو یہ ادا اس قدر ناپسند ہے کہ ایسے تمام لوگوں کے لیے نہایت ذلت آمیز جہنم کی وعید سنائی گئی ہے۔

عقیقہ کے احکام (۲)

مفتی راشد حسین ندوی

حلق کے بعد بچہ کے سر پر زعفران ملنا:

حلق کے بعد افضل یہ ہے کہ بچہ کے سر پر زعفران (زعفران نہ ملے تو کوئی دوسری خوشبو) مل دی جائے، چنانچہ ابو داؤد میں حضرت بریدہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں: جاہلیت میں ہم میں سے کسی کے یہاں جب بچہ پیدا ہوتا تھا تو وہ بکرا ذبح کرتا تھا اور بچہ کے سر کو اس کے خون سے لتھڑ دیتا تھا، پھر جب اسلام آیا تو ہم ساتویں دن بکرا ذبح کرتے تھے، بچہ کا سر مونڈتے تھے اور سر پر زعفران ملتے تھے۔ (ابوداؤد)

بال کے ہم وزن چاندی صدقہ کرنا:

مستحب یہ ہے کہ بچہ کے بال مونڈ کر ان کے ہم وزن چاندی صدقہ کرے، چنانچہ ترمذی کی حضرت علیؓ سے مروی روایت میں ہے کہ حضرت حسن کا عقیقہ کرتے وقت آپ ﷺ نے حضرت فاطمہ کو اس کا حکم دیا تھا، چاندی کے بجائے روپیہ پیسہ یا کوئی دوسرا سامان بھی صدقہ کیا جاسکتا ہے۔

عقیقہ کی دعا:

عقیقہ کے لیے کوئی مخصوص دعا پڑھنا ضروری نہیں ہے، دل میں عقیقہ کی نیت کے ساتھ "بِسْمِ اللّٰہِ اَللّٰہُ أَکْبَرُ" کہہ کر ذبح کرلے تو عقیقہ ہوجائے گا، قربانی کے احکام بیان کرتے ہوئے جو دعا لکھی ہوئی ہے بہتر ہوگا کہ عقیقہ کے وقت اس کو پڑھ لیا جائے: إِنِّي وَجَّهْتُ سے وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ تک، پھر اَللّٰهُمَّ مِنْكَ وَلَكَ پڑھے اور "بِسْمِ اللّٰہِ اَللّٰہُ أَکْبَرُ" کہہ کے جانور ذبح کردے، جو آداب قربانی کے وقت قبلہ رو رکھنے اور رہنے وغیرہ کے بتائے گئے ہیں، ان کا بھی خیال رکھے۔ (رحیمیہ: ۲/۹۳، کتاب الفتاوی: ۴/۱۷۸)

بعض احادیث میں مذکور ہے کہ ذبح سے پہلے یہ الفاظ کہے:

"بِسْمِ اللّٰهِ، اَللّٰهُمَّ لَكَ وَإِلَيْكَ هٰذِهِ عَقِيْقَةُ فُلَانٍ" (فلاں کے بجائے بچہ یا بچی کا نام لے) (مصنف عبد الرزاق، كتاب العقيقة: ٧٩٦٣٠، مسند أبي يعلى: ٤/ ١١٣-١١٤ (٤٥٠٤) السنن الكبرى للبيهقي: ٩/٣٠٣)

بعض کتابوں میں اس دعا کو بڑھا کر اس طرح لکھا گیا ہے:

"اَللّٰهُمَّ هٰذِهِ عَقِيْقَةُ (اس جگہ بچہ کا نام لے) دَمُهَا بِدَمِهٖ وَعَظْمُهَا بِعَظْمِهٖ وَجِلْدُهَا بِجِلْدِهٖ وَشَعْرُهَا بِشَعْرِهٖ، اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ فِدَاءً لَهٗ" اگر لڑکی ہو تو "دَمُهَا بِدَمِهَا وَعَظْمُهَا بِعَظْمِهَا وَجِلْدُهَا بِجِلْدِهَا وَشَعْرُهَا بِشَعْرِهَا اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهَا فِدَاءً لَهَا" کہے، شروع کی دعا پہلے جیسی رہے گی۔ (فتاوی رحیمیہ: ۲/۹۳، کتاب الفتاوی: ۴/۱۷۸)

ختنہ - ایک تاکیدی سنت:

بخاری ومسلم کی حدیث میں ختنہ کو خصال فطرت (فطرت کی عادتوں) میں شمار کیا گیا ہے، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: پانچ چیزیں فطرت میں سے ہیں: ختنہ کرنا، زیر ناف کے بال مونڈنا، بغل کے بال اکھاڑنا، ناخن تراشنا اور مونچھیں کاٹنا۔ (بخاری ومسلم)

امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور ایک روایت کے مطابق امام مالکؒ کے نزدیک ختنہ کرنا واجب ہے، لیکن امام مالک کے دوسرے قول میں اس کو سنت قرار دیا گیا ہے، امام ابوحنیفہ کا مشہور قول بھی یہی ہے، لیکن اس کی حیثیت اسلام کے شعار جیسی ہے، لہٰذا اس کو ترک نہیں کرنا چاہیے، چنانچہ مسلمان سختی کے ساتھ اس پر عمل کرتے ہیں۔ (ہندیہ: ۵/۳۵۷)

ختنہ کا وقت:

ختنہ کے لیے باقاعدہ کوئی عمر مقرر نہیں ہے، البتہ فقہاء نے لکھا ہے کہ اس کا مستحب وقت سات سال سے بارہ سال کے درمیان ہے۔ (ہندیہ: ۵/۳۵۷)

بیہقی کی کئی ضعیف روایات میں ولادت کے ساتویں دن

ختنہ کرانے کا ذکر ہے۔

نو مسلم کا ختنہ:

اگر کسی نے اسلام قبول کیا تو اگر آسانی سے ختنہ کرایا جاسکتا ہو تو کرا دینا چاہیے اور اگر یہ محسوس ہو رہا ہو کہ یہ ختنہ کی تکلیف برداشت نہیں کرسکے گا، یا ڈاکٹر اس کے لیے اس کو مضر قرار دیتا ہو تو ختنہ چھوڑا جاسکتا ہے۔ (ہندیہ: ۵/ ۳۵۷)

ختنہ کے فوائد:

ختنہ ملت ابراہیمی کا شعار ہے، اس کی پابندی عربوں کے ساتھ ساتھ یہودی بھی کرتے تھے اور آج بھی یہودی اس کے پابند ہیں، ہمارے لیے اصل اللہ اور رسول کا حکم ہے، اسی لیے ہم اس کی پابندی کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی اس میں بہت سے فوائد بھی ہیں؛

۱-اس سے طہارت کامل طور سے ہوتی ہے جو کہ غیر مختون کے لیے ممکن نہیں ہوتی۔

۲-ختنہ پر ریسرچ کرنے والے ڈاکٹروں نے متفقہ طور پر لکھا ہے کہ یہ عضو تناسل کے کینسر سے بچاتا ہے۔

۳-ختنہ سے ایڈز کے مرض میں مبتلا ہونے کا امکان کم ہوتا ہے، یہ بات اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ میں کہی گئی ہے۔

۴-سوزاک اور اس طرح کے کئی امراض سے محفوظ رکھتا ہے۔ (بچوں کے احکام و مسائل: ۱۶۰-۱۶۱)

بچوں کے کان میں اذان کہنا:

بچہ کی پیدائش کے بعد اس کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہنا مستحب ہے، بعض احادیث میں اس کا ذکر ہے، اگرچہ ان احادیث پر کلام کیا گیا ہے لیکن بہت سے علماء نے فضائل میں ان کو لائق استدلال قرار دیا ہے، ان علماء میں امام ترمذی جیسے بلند مرتبہ ائمہ اور زمانہ قریب کے بعض غیر مقلد علماء جیسے علی بن احمد کندی بھی شامل ہیں، چنانچہ حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں؛ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ جب حضرت حسن بن علی کی ولادت ہوئی تو آپ نے ان کے کان میں نماز والی اذان کہی۔ (ابوداؤد و ترمذی)

مسند ابو یعلی کی روایت میں ہے کہ دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہی، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے مروی ہے کہ جب کسی بچہ کی ولادت ہوتی تو وہ اس کو کپڑے میں لپیٹ کر اٹھاتے، اس کے دائیں کان میں اذان اور بائیں میں اقامت کہتے۔ (مصنف عبدالرزاق: ۷۹۸۵)

اذان و اقامت کا طریقہ:

اس اذان اور اقامت کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ مؤذن قبلہ رو کھڑا ہو جائے اور بچہ کو اس کے سامنے اٹھا کر بچہ کے دائیں کان کو اس کی طرف کر دیا جائے اور وہ اذان کہے، پھر بائیں کان کو سامنے کر دیا جائے اور وہ اقامت کہے، اذان کو ٹھہر ٹھہر کر کہے، جیسے نماز والی اذان میں ہوتا ہے اور اقامت کو جلدی جلدی کہے، نماز والی اذان کی طرح حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ اور حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ پر دائیں بائیں رخ پھیر لینا بھی مستحب ہے، لیکن آواز کو بہت بلند کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

(تقریرات رافعی: ۱/ ۴۵، کتاب الفتاوی: ۹/ ۶۶)

اگر مردوں میں سے کوئی موجود نہ ہو تو عورت اذان واقامت کہہ دے تو کافی ہوگا، لیکن اگر اس کا اندیشہ ہو کہ نامحرموں تک آواز پہنچے گی تو اس سے احتراز ہی بہتر ہے۔

فون پر کسی سے اذان کہلا کر بچہ کے کان میں موبائل لگا دیا جائے تو اس میں شبہ نہیں کہ بچہ کے کان میں اللہ کا نام پہنچ جائے گا، لیکن اوپر جو آداب بیان کیے گئے ہیں وہ چھوٹ جائیں گے، اس لیے کوشش اس سے بچنے کی کی جائے، ناگزیر حالات میں استحباب کی ادائیگی ہو جائے گی۔ (کتاب الفتاوی: ۹/ ۶۶-۶۷)

اذان کا وقت:

اس اذان کا احادیث میں کوئی وقت باقاعدہ مقرر نہیں کیا گیا، فقہاء نے بھی اس کی تصریح نہیں کی، لیکن حدیث میں ہے کہ "حِينَ وَلَدَتْهُ فَاطِمَةُ" جب حضرت حسن کی ولادت ہوئی تب آنحضور

ﷺ نے اذان دی، لہٰذا اس میں ممکن طور سے عجلت سے کام لینا چاہیے، مثلاً: ولادت کے بعد جیسے ہی بچہ کو نہلانے سے فراغت ہو 'اذان دے دی جائے اور اگر نہلانے میں ڈاکٹر کے مشورہ سے تاخیر ہو رہی ہو تو پہلے بھی اذان دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اذان کے فائدے:

۱-اذان سے بچوں کو اُمُّ الصِّبْیَانُ (جو بچوں کا ایک جان لیوا مرض ہے) نہیں ہوتا۔(تقریرات رافعی:۱/۴۵)

۲-بچہ شیطانی اثرات سے محفوظ رہتا ہے۔

۳-ابتداء ہی میں بچہ کے کان میں کلمہ توحید پہنچ جاتا ہے۔

(بچوں کے احکام و مسائل: ۷۵-۷۶، بحوالہ تحفۃ المودود وحجۃ اللہ البالغہ)

بچہ کی تحنیک:

سنت یہ ہے کہ جب بچہ پیدا ہو تو کسی نیک شخص سے کھجور چبوا کر اس کا شیرہ یا کوئی میٹھی چیز مثلاً: شہد وغیرہ بچہ کے تالو میں چٹا دیا جائے اور بچہ کے لیے نیک لوگوں سے دعا کرائی جائے، اس عمل کو تحنیک کہتے ہیں، حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ بچے آپ کے پاس لائے جاتے تھے، تو آپ ان کے لیے دعا فرماتے تھے اور تحنیک کرتے تھے۔(مسلم، ابوداؤد)

مسلم سائنسداں الزہراوی

(Father of Surgeries)

ابوالقاسم بن خلف بن عباس قرطبہ کی نواحی بستی الزہرا میں 1030ء کو پیدا ہوئے اور اسی نسبت سے الزہراوی کہلائے، البتہ یورپ میں Abulcasis اور Alsahravius جیسے ناموں سے مشہور ہیں، طب کی دنیا میں آپ سب سے پہلے سرجن ہیں۔

زہراوی سے قبل صرف علاج بالدواء کا طریقہ رائج تھا، زہراوی نے اپنے تجربات کے بعد سرجری کے ذریعہ علاج کے طریقے کو مرتب کیا اور اسے ایک مستقل فن بنا دیا، اس نے سر سے پاؤں تک ان امراض کی نشان دہی کی جن کا علاج سرجری سے کیا جا سکتا ہے۔

الزہراوی پہلے طبیب ہیں جنھوں نے آپریشن کیا، جراحی کے آلات کو عملاً متعارف کرایا، آنکھوں اور دانتوں کی سرجری کی، قطع اعضاء اور پٹی باندھنے کے عملی طریقے بیان کیے، ٹوٹی ہوئی ہڈی کو جوڑنے کا طریقہ بتایا، کٹی ہوئی شریانوں کا خون بند کرنے کے لیے انھیں باندھنے اور ہڈیوں کو جوڑنے کے بعد ان پر پلستر چڑھانے کے طریقے بتائے، زخموں کو ٹانکنے کے لیے دھاگوں اور تانتوں کا استعمال کرنا بھی انہیں کی اختراع ہے، مزید برآں آپریشن سے پہلے مسکن دوا کھلانا بھی الزہراوی ہی کی ایجاد ہے۔

زہراوی نے "التصریف لمن عجز عن التألیف" کے نام سے ایک ضخیم کتاب بھی تحریر کی ہے جو طب کی تاریخ میں ایک زریں کارنامہ ہے، اس کتاب میں تقریباً دو سو ایسے آلات کی تصویریں ہیں جو عمل جراحی میں درکار ہوتے ہیں۔

سارٹن (George Sarton) کا بیان ملاحظہ فرمائیں:

"Abu-l-Qasim (Abulcasis) was the greatest Muslim surgeon; he exerted a very influence upon the development of European surgery down to the Renaissance."

(Introdution to the History of Science, V.1, P.651)

(ابوالقاسم عظیم ترین مسلم سرجن تھے، انھوں نے نشاۃ ثانیہ تک یورپ کی سرجری پر بہت گہرا اثر ڈالا)

ہندوستان - نجکاری کی زد میں
(India Under Privatization)

سید محمد مکی حسنی ندوی

سرمایہ داری (Capitalism) ایک ایسا معاشی نظام ہے جس میں سرمایہ نجی شعبہ کی ملکیت ہوتا ہے اور نفع ونقصان کا انحصار ذاتی فیصلوں پر ہوتا ہے، پیداوار کی قیمت اور مقدار کا تعین کمپنیوں کے مابین مقابلوں پر ہوتا ہے، حکومت کسی بھی طرح سے اس میں دخیل نہیں ہوتی ہے۔

اس ضابطہ کے تحت کہا جاسکتا ہے کہ اگر خالص سرمایہ دارانہ نظام کا نفاذ ہوتا ہے تو کوئی بھی سرکاری نظام جیسے عوامی تحفظ، پولیس، سڑکیں اور اسپتال وغیرہ عوامی نہیں رہیں گے۔یہی وجہ ہے کہ اس وقت مکمل سرمایہ دارانہ نظام پوری دنیا میں کہیں بھی نافذ نہیں ہے، حکومت کو کہیں نہ کہیں مداخلت کرنی ہی پڑتی ہے۔

ہندوستان میں جو سرمایہ دارانہ نظام رائج ہے اس میں ایک طرف نجی شعبوں کو آزادی حاصل ہے تو دوسری طرف عوامی فلاح و بہبود کی کامیاب سعی بھی قائم ہے، اسی لیے اسے ''مخلوط معیشت'' (Mixed Economy) کہتے ہیں۔

ہندوستان میں سرمایہ دارانہ نظام کی تاریخ برٹش گورنمنٹ کی ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' (East India Company) سے ملتی ہے، انگریزوں نے تجارت کے عنوان سے ہی ہندوستان میں قدم رکھا اور پھر سرمایہ دارانہ نظام کے ذریعہ یہاں کی معاشی اور پھر سیاسی نظام پر پوری طرح قابض ہوگئے اور یہ ملک انگریز سامراج کا غلام بن گیا۔

۱۸۵۷ء کی ''تحریک آزادی'' (Rebellion) کے بعد پورے ملک کے باشندوں نے سرمایہ داری کے ظالمانہ نظام کے خلاف متحد ہوکر آواز بلند کی جس کے نتیجہ میں ''سودیشی تحریک'' (Swadeshi Movement) کو فروغ حاصل ہوا، جس سے ملک کے چھوٹے بڑے سبھی سرمایہ داروں کو تجارت کے مواقع حاصل ہوئے اور معاشی اعتبار سے عوام کو قدرے راحت نصیب ہوئی۔

سرمایہ دارانہ نظام کا سب سے بڑا نقصان حکومت کی عدم مداخلت کے ساتھ ''نجکاری'' (Privatization) کی تقویت اور اس کا فروغ ہے۔

نجکاری اس نظام عمل کو کہتے ہیں جس میں کوئی حکومتی شعبہ، ملکیت یا تجارت، نجی شعبہ یا شخص کو منتقل کی جائے۔اس سے حکومت کو براہ راست فائدہ اور عوام کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے، حکومت جہاں مخصوص آمدنی حاصل کرتی ہے اور مختلف قسم کے اخراجات اور نظم ونسق کے جھمیلوں سے بچ جاتی ہے وہیں نجی کمپنیاں زیادہ سے زیادہ منفعت کے حصول میں عوام کا بے دریغ استحصال کرتی ہیں۔

نجی کمپنی کے مالک اس کے شرکاء (Share Holders) ہوتے ہیں، ان کمپنیوں کا مطمح نظر زیادہ سے زیادہ منفعت کا حصول ہوتا ہے جو اس کے شرکاء میں تقسیم ہوتا ہے، جبکہ عوامی کمپنی کا مقصد عوامی فلاح و بہبود اور ان کی خوشحالی ہوتا ہے، چنانچہ اس کو حاصل ہونے والی منفعت حکومت کے کھاتہ میں جاتی ہے جو عوام کی فلاح و بہبود میں استعمال ہوتی ہے۔

نجکاری کے چند سنگین نقصانات ملاحظہ ہوں:

۱-اجارہ داری کو تقویت:

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی اہم شعبہ کی ملکیت کسی نجی کمپنی کو حاصل ہوجاتی ہے جس میں حکومت کا عمل دخل نہیں ہوتا، اس سے اجارہ داری (Monopoly) کو تقویت حاصل ہوتی ہے، کمپنی اپنی مرضی چلاتی ہے اور زیادہ سے زیادہ فائدہ کے حصول میں عوام کا

استحصال کرتی ہے،اس کی ایک واضح مثال مروجہ اسکولی نظام ہے۔

آج مختلف ممالک کا اسکولی نظام رفتہ رفتہ نجی کمپنیوں کے اختیار میں جا رہا ہے،حکومتی مداخلت کم ہوتی جا رہی ہے، چونکہ ان کمپنیوں کا مقصد تعلیم کے ذریعہ نفع کا حصول ہے،اس لیے تعلیم کے مختلف اخراجات اور فیس وغیرہ کا گراف اس قدر اونچا ہے کہ غریب عوام اس کا تحمل نہیں کر پاتے اور ایک بڑا طبقہ اعلیٰ تعلیم سے محروم ہوتا جا رہا ہے۔

۴-اجارہ داری کو قابو کرنے میں دشواری:

اسے موبائل کمپنیوں کی مثال سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے، سرمایہ دارانہ نظام کا نتیجہ ہے کہ بڑی موبائل کمپنیاں اپنے اثر ورسوخ اور رشوت کے ذریعہ ایسے قوانین نافذ کروانے میں کامیاب ہو جاتی ہیں جن سے دوسری چھوٹی کمپنیوں کو بھاری نقصان اٹھانا پڑتا ہے، پھر مجبوراً چھوٹی کمپنیاں یا تو بند ہو جاتی ہیں یا ان بڑی کمپنیوں کے ہاتھوں نیلام ہو جاتی ہیں اور پھر بڑی کمپنیاں مدمقابل نہ ہونے کی وجہ سے جو قیمت چاہتی ہیں متعین کرتی ہیں اور چونکہ موبائل عام زندگی میں ایک ضرورت کی طرح شامل ہے اس لیے صارفین ہر قیمت ادا کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

۲-مفاد عامہ کا نقصان:

ملک میں متعدد محکمے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں، یہ محکمے خالص عوام کی فلاح و بہبود (Public Interest) کے لیے قائم ہوتے ہیں جیسے اسکول، ہسپتال، پولیس، ریل، کھیتی باڑی وغیرہ، اگر ان پر بھی نج کاری ہوگئی تو عوام کے متوسط اور نچلے درجہ کا طبقہ نہ صرف پریشان حال ہوگا بلکہ اس کا وجود بھی خطرہ میں پڑ سکتا ہے،اس لیے ایسے سبھی شعبوں کو حکومت کے ماتحت ہی ہونا چاہیے۔

۳-حکومت کا مالی نقصان:

اگر نجی کمپنی حکومت کا کوئی شعبہ یا ادارہ چلائے گی تو حکومت کو مختصر فائدہ ہوگا جبکہ کمپنی کئی گنا فائدہ اٹھائے گی،حکومت کے ایسے بہت سے شعبے ہیں جن کی حکومت سختی سے نگرانی کرے تو وہ منفعت کئی گنا بڑھ سکتی ہے جیسے ریلوے کا نظام ہے،حکومت نے اس میں نجکاری کو موقع دے کر ممکن ہے فوری فائدہ اٹھالیا ہو لیکن مستقل کثیر منفعت سے خود کو محروم بھی کر لیا۔

۵-صنعتوں کا بکھرنا:

نجکاری میں کبھی یہ ہوتا ہے کہ مکمل کوئی شعبہ کسی ایک کمپنی کے پاس نہیں ہوتا، بلکہ اس شعبہ کے مختلف حصوں پر مختلف کمپنیوں کی اجارہ داری ہوتی ہے،اس طرح ایک شعبہ کے کئی حصے دار ہو جاتے ہیں جیسے برطانیہ میں ریل کی نجکاری نے ریل نیٹ ورک کو بنیادی ڈھانچہ (Infrastructure) اور ریل چلانے والی کمپنیوں میں تقسیم کر دیا،اب حکومت یہ طے نہ کر سکی کہ برطانیہ میں اکتوبر ۲۰۰۰ء کے ریل حادثہ کا ذمہ دار کون ہے۔

بدعنوانی (Corruption) کے متعلق یہ تصور کرنا غلط ہے کہ نجی کمپنیوں کے آنے سے ختم ہو جائے گی، بلکہ نجی کمپنی ہر ممکنہ منافع کو حاصل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتی، اس سے ان کو کوئی مطلب نہیں کہ کس کا نقصان ہو رہا ہے!

اگر سرکاری لوگ کام میں سست ہیں تو نجی کمپنی میں نچلی سطح کے Employee کا استحصال ہوتا ہے اور اونچی سطح پر کام کرنے والوں کی اجارہ داری ہوتی ہے۔

آزادانہ نجکاری کسی مسئلہ کا حل نہیں، بلکہ حکومتی سطح پر مضبوط قوانین اور اس پر عمل درآمد ہی اصل حل ہے،اگر قوانین پر حکومت کاربند ہو جائے تو دہلی کی بجلی کا شعبہ اور جاپان کا ریل شعبہ نجکاری پر مضبوط قوانین کی بہترین مثال ہے، جہاں مفاد عامہ کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔

اگر مفاد عامہ سے صرف نظر حکومت نے سرمایہ دارانہ نظام کی نجکاری کو فروغ دیا تو ملک میں سماج نہیں Colony ہوگی اور عوام نہیں غلام ہوں گے،مال دار کا گزر بسر ہوگا مگر متوسط اور نچلے طبقہ کے شہری دھیرے دھیرے اپنے حقوق سے محروم ہو جائیں گے،اس طرح ہندوستان ایک بار پھر کسی ایسٹ انڈیا کمپنی کا غلام ہو جائے گا۔

اسلام کا تصورِ دعوت

محمد ارمغان بدایونی ندوی

اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے، مستقل شریعت ہے، زندگی گذارنے کا مکمل دستور العمل ہے اور اس کی تعلیمات آفاقی ہیں، جن کا اقتضا ہے کہ ان کو زمانی اور مکانی رقبہ میں محدود نہ رکھا جائے، بلکہ اقوام عالم کو بھی ان سے روشناس کرایا جائے اور اس کے لیے کوئی ایک خاص طریقہ لازم نہ کیا جائے، بلکہ ہر مسلمان اپنے قول وعمل اور کردار و گفتار سے یہ باور کرائے کہ وہ اس دنیائے انسانیت کا حقیقی خیر خواہ اور اقوام عالم کی حالت زار کی اصلاح کا حریص ہے۔

''دعوت'' اشاعت اسلام کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے، جس کے مقابل دیگر وسائل ثانوی درجہ کے ہیں، دعوت کا مقصود پیغام الٰہی کو لوگوں تک پہنچانا ہے۔ دین اسلام نے میدانِ دعوت کی ہمہ گیری اور وسعت کے پیش نظر کارِ دعوت کو شرائط ولوازم کے ساتھ مخصوص نہیں کیا، بلکہ اس کے لیے بنیادی اصول فراہم کر دیے ہیں جن کی روشنی میں مسلمانوں کو دعوت کا فریضہ انجام دینا ہے، قرآن مجید میں بنیادی طور پر دعوت کے تین اصول بتائے گئے ہیں:

﴿ادۡعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالۡحِكۡمَةِ وَالۡمَوۡعِظَةِ الۡحَسَنَةِ وَجَادِلۡهُم بِالَّتِي هِيَ أَحۡسَنُ﴾(النحل: ۱۲۵) (اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ بلاتے رہیے اور اچھے طریقہ پر ان سے بحث کیجیے)

قرآنی نقطہ نظر سے دعوت کے تین اسلوب ہیں: حکمت، نصیحت اور مجادلہ حسنہ، گویا اسلام دعوت کا یہ تصور پیش کرتا ہے کہ دعوت کے اول مرحلہ میں حکمت کا اسلوب اختیار کیا جائے، یہ حکمت قولی بھی ہو اور عملی بھی، پھر حقیقی خیر خواہی کا طرز اپنایا جائے اور یہ خیر خواہی کردار و گفتار دونوں سے ہو اور اگر بعض مواقع پر بحث ومباحثہ کی ضرورت پیش آجائے تو طرز تکلم میں نرمی اختیار کی جائے۔

آیت بالا میں ''رب کے راستہ کی دعوت'' کہہ کر داعی کو آزاد کر دیا گیا ہے، لہٰذا ایک داعی دعوت دین میں ایسی کسی شرط کا پابند نہیں کہ اولاً اسے اسلام کے ارکان خمسہ کی دعوت دینا ہے یا اخلاق حسنہ کی ترغیب دینا ہے، بلکہ وہ دعوت کے میدان میں مخاطب کی رعایت کا پابند ہے، جیسے مخاطب ہوں گے' اسی معیار سے ان کے سامنے رب کے راستہ کی طرف دعوت پیش کی جائے گی۔

آیت بالا میں حکمت حسنہ کا اسلوب اختیار کرنے کی بھی تلقین ہے، حکمت کے مختلف پہلو ممکن ہیں، لہٰذا جیسا سماج ہوگا' حکمت کا پہلو بھی ویسا ہی استعمال کیا جائے گا، اگر واقعات وقصص کسی سماج میں اثر انداز ہو سکتے ہیں تو وہ اختیار کیے جائیں گے اور اگر تمثیلات یا فصاحت وبلاغت کا اسلوب مؤثر ہوگا تو وہ قابل استعمال ہوگا۔

نصیحت کا اسلوب بھی بڑا مؤثر ہے، نصیحت یعنی خیر خواہی کا وصف داعی کا شیوہ ہونا چاہیے جو تمام انبیاء کا امتیازی وصف ہے۔

مجادلہ حسنہ کی تعلیم بھی اسلام ہی کا امتیاز ہے جس کی موجودگی میں انسان اپنے معیار سے بھی نہیں گرتا اور اخلاقی حدود سے بھی باہر نہیں جاتا، ورنہ اگر کوئی داعی صرف حکمت اور نصیحت کے طریقہ پر کاربند رہے تو بسا اوقات مخاطب کی کٹ حجتی کے وقت احساس کہتری کا شکار بھی ہو سکتا ہے، لیکن اسلام نے اس بات کی بھی پوری رعایت کی ہے اور اخلاقی حدود میں رہتے ہوئے اسلام کی نافعیت کو اس طریقہ سے پیش کرنے کی پوری اجازت دی ہے۔

اسلام کا مطالبہ ہے کہ اصحاب دعوت خود اس پیغام پر پورا یقین رکھتے ہوں اور عملاً اس کا ثبوت بھی فراہم کرتے ہوں، وہ صبر ووفا کا پیکر ہوں، عزیمت کا نشان ہوں، مزاج کے نرم ہوں، ان کی طبیعت میں شفقت ورحمت ہو، ان کی شخصیت صلاح واصلاح کی جامع ہو، وہ فہم وفراست کے مالک ہوں، ان کی زندگی خوش خلقی سے تعبیر ہو، بے نیازی ان کی شان ہو، عفو ودرگزر ان کا شیوہ ہو، تقوی ان کی زندگی ہو اور وہ اپنے مخاطب کے ذہنی معیار اور علمی سطح سے بھی بخوبی واقف ہوں۔

اصول اور فروع کی عدم تمیز

مسلمانوں کے زوال کا ایک بنیادی سبب

محمد نفیس خاں ندوی

اسلام کے احکامات دو طرح کے ہیں ، ایک وہ ہیں جنھیں ’’اصول دین‘‘ قرار دیا جاتا ہے اور دوسرے وہ جنھیں ’’فروع دین‘‘ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اصول دین میں کسی بھی اختلاف کی گنجائش نہیں ہے، بلکہ ان میں اختلاف کرنے والے دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔

اصول دین کی وضاحت علامہ شمس الدین مناویؒ نے ان الفاظ میں کی ہے:

”فأصول الديانات كلها التوحيد وصفات البارى عزوجل، والايمان بالغيب كالجنة والبعث والجزاء والصراط والحوض والشفاعة وعذاب القبر، وكذلك فروع الدينيات التى تعلم وجوبها بدليل مقطوع به، فلا يجوز الاختلاف فى شئ من ذلك، ولا مسوغ للاختلاف فيه أصلا، ومن خالف فى شئ من ذلك فهو اما كافر أو ضال، أعاذنا الله من ذلك.“

(آسمانی شریعت کا اصل محور توحید ، صفات باری ، ایمان بالغیب جیسے جنت ، حیات بعد الموت ، جزاو سزا ، پل صراط ، حوض کوثر ، شفاعت اور عذاب قبر ہے۔ اسی طرح شرعی احکام کی وہ فروعات بھی ہیں جن کا وجوب دلیل قطعی سے ثابت ہے ، ان میں سے کسی بھی چیز میں نہ اختلاف روا ہے اور نہ اصولی طور پر اختلاف کی گنجائش ہے ، جو بھی ان میں اختلاف کرے وہ یا تو کافر ہے یا گمراہ۔ اللہ تعالی ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔)

فروع دین یعنی جن میں اختلاف کی پوری گنجائش ہے ، جنھیں ہم ’’اجتہادی مسائل‘‘ بھی کہہ سکتے ہیں ، ائمہ اربعہ کے ’’فقہی مسالک‘‘ اور ان کے مابین اختلافات اسی نوعیت کے ہیں ، فروعات کی وضاحت علامہ مناویؒ نے ان الفاظ میں کی ہے:

”وأما الذى يسوغ فيه الاختلاف فهى فروع الديانات اذا استخرجت أحكامها بأمارات الاجتهاد ومعانى الاستنباط، فهذه يسوغ فيها اختلاف العلماء، ولكل واحد منهم أن يعمل بما يؤدى اليه اجتهاده۔“

(رہے وہ مسائل جن میں اختلاف کی گنجائش ہے تو یہ دین کے وہ فروعی مسائل ہیں جن کا استخراج ، اجتہاد و استنباط کے طریقوں پر کیا جاتا ہے ، ان میں علماء کو اختلاف کا پورا حق ہے اور ہر ایک کو اپنے اجتہاد کے مطابق عمل بھی کرنا چاہیے)

اجتہادی مسائل میں حق و باطل کا اختلاف نہیں بلکہ صواب و احتمال خطا کا اختلاف ہے جبکہ دونوں صورتوں میں اجر کا استحقاق یقینی ہے ، صحابہ کرامؓ سے لے کر علمائے امت فروعی مسائل میں اختلاف کرتے آئے ہیں ، بسا اوقات ایک ہی مجتہد کا اختلاف زمان و مکان کے فرق اور احوال و تقاضے کے بدلنے پر مختلف نظر آتا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اور صاحبینؒ کے مابین جہاں اختلاف کی اور بھی نوعیتیں ہیں ان میں ایک بڑا حصہ اس قسم کے اختلاف کا بھی ہے ، اصحاب فقہ ’’اختلاف زمان و مکان‘‘ کی تعبیر سے اسی طرف اشارہ کرتے ہیں ، امام شافعیؒ کے اقوال جدیدہ و اقوال قدیمہ میں تنوع اسی کا نتیجہ ہے۔

فروعات دین کے فہم و استنباط میں ائمہ دین کا جو اختلاف ہوا وہ ایک تاریخی حقیقت ہے ، امت کے علماء کرام ، مفسرین و محدثین عظام نے ان اختلافات کو قبول کیا اور کسی کو بھی ناحق نہیں سمجھا ، بلکہ اعیان امت نے ان اختلافات کو شریعت اسلامی کا امتیاز اور خدا کی رحمت قرار دیا۔ اس اختلاف میں جو چیز ممنوع اور قبیح ہے وہ اختلاف کو فرقہ

بندی کا ذریعہ بنانا، ایک دوسرے کی عزت وآبرو کو حلال سمجھنا، لغزشوں اور خطاؤں کو تلاش کرنا اور معاشرہ میں انتشار پیدا کرنا ہے۔

ائمہ اجتہادؒ اصول وفروع کے مابین امتیاز سے اچھی طرح واقف تھے، فروعات میں بے جا شدت اور مسلکی تعصب سے وہ بہت دور تھے، اپنے اجتہادات میں متصلب ہونے کے باوجود دوسروں کی آراء اور ان کے موقف کا پورا احترام کرتے تھے، ایک دوسرے کی توقیر میں بغیر کسی جھجک کے نماز ادا کرتے، تاریخ میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں:

☆امام شافعی نے فجر کی نماز مسجد ابی حنیفہ میں ادا کی اور امام ابوحنیفہ کے ادب واحترام میں نہ جہراً بسم اللہ پڑھی اور نہ قنوت نازلہ پڑھی۔

☆ایک مرتبہ ہارون رشید نے وضو کے بعد فاسد خون نکلوایا اور امام مالکؒ کے مسلک کے مطابق دوبارہ وضو کیے بغیر نماز پڑھائی اور امام ابو یوسفؒ نے ان کی اقتدا میں نماز ادا کی، حالانکہ ان کے نزدیک جسم سے خون نکلنا ناقض وضو ہے، کسی نے پوچھا تو آپ نے جواب دیا کہ اگر امام مالکؒ اور سعید بن المسیبؒ نماز پڑھاتے تو کیا میں ان کے پیچھے نماز نہ پڑھتا؟!

☆امام احمد بن حنبل اور امام بخاری کے مایہ ناز استاذ علی بن مدینی سے امام احمد کا کسی مسئلہ میں اختلاف ہوا اور بحث وتکرار کی نوبت آگئی، اندیشہ تھا کہ اس کی وجہ سے بدمزگی پیدا ہوجائے گی، لیکن جب ابن مدینی واپس جانے کے لیے سواری پر بیٹھے تو امام احمد بن حنبل نے اس درجہ احترام کا معاملہ کیا کہ سواری کی رکاب تھام لی۔

☆امام شافعیؒ اور ان کے شاگرد یونس حلاقیؒ کے درمیان ایک مسئلہ کو لے کر خوب بحث وتکرار ہوئی، لیکن جب دوبارہ ملاقات ہوئی تو امام شافعی نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کہ اگرچہ ہم ایک مسئلہ میں متفق نہ ہوسکے تو کیا آپس میں بھائی بن کر نہیں رہ سکتے۔

لیکن جب علمی پختگی میں کمی واقع ہوئی، احکام کے مابین درجات اور ان کے حقوق سے عدم معرفت پیدا ہوئی تو ایسے سنگین نتائج سامنے آئے کہ مسلک ومذہب کے نام پر مسلمانوں نے ایک دوسرے کے سر پھوڑے، پگڑیاں اچھالیں اور فسادات کا بازار گرم کیا، تاریخ کے سینہ میں ایسی دسیوں خونیں شہادتیں دفن ہیں۔

مسلمانوں کے مابین اختلاف کا ایک بہت بڑا سبب ''اصول وفروع کا عدم امتیاز'' ہی ہے، کہیں مستحب کے ساتھ فرض والا معاملہ کیا جارہا ہے تو کہیں مکروہ کے ساتھ حرام والا، مثال کے طور پر اقامت کے وقت بیٹھے رہنا، قائلین کے نزدیک مستحب اور منکرین کے نزدیک مکروہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا مکروہ کے ارتکاب، یا مستحب کے ترک پر شریعت نے ملامت کی اجازت دی ہے؟ بالکل نہیں! یہی افراط وتفریط رفع یدین، آمین بالجہر جیسے فروعی مسائل میں بھی ہے۔ اسی طرح ایسے واقعات بھی ہوئے ہیں کہ صحابہ کرام کی شان میں گستاخی برداشت کرلی گئی لیکن مخصوص ادارہ یا مخصوص شخصیت کی شان میں ادنیٰ بے ادبی بھی گوارہ نہ کی گئی، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان گروہ بندی، فرقہ پرستی اور جماعت بندی کا شکار ہوتے گئے، ہر طبقہ اپنے مذہب کی مدد اور دوسرے طائفہ کے عقائد ونظریات کے ساتھ دشمنی کرنے لگا، اور اس دشمنی سے نہ صرف مسلمانوں کی وحدت کا شیرازہ منتشر ہوا بلکہ ملکی وعالمی سطح پر علماء کا وقار مجروح ہوا اور پوری امت کی جگ ہنسائی بھی ہوئی۔

آج بھی مسلمانوں میں یہ مرض پوری طرح سے سرایت کیے ہوئے ہے، اجتہادی وفروعی مسائل کے اختلاف کی بنیاد پر مخالفین کو گمراہ قرار دیا جارہا ہے، یہاں تک کہ امت کے فقہاء ومحدثین پر بھی فرد جرم عائد کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، ایسے جوش وجذبہ کا مظاہر کیا جارہا ہے گویا یہی مدار نجات ہے، پہلے تو معاملہ علمی وفقہی اختلاف تک تھا، اب بات اداروں، تحریکوں، تنظیموں اور خانقاہوں تک آپہنچی ہے، مناظروں کا بازار گرم ہے، تکفیر وتفسیق کے فتوے جاری ہیں حتی کہ مسجدوں کو بھی مسلک کے ساتھ خاص کردیا گیا ہے، اختلاف در اختلاف نے مسلمانوں کا جو حال کیا ہے وہ سب کی نگاہوں کے سامنے ہے۔

(اصلاحی خطبات)

دعوتی سرگرمیوں کی ناکامی کے اسباب

جسٹس مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی

’’جو اسلامی تعلیمات فرد سے متعلق ہیں، وہ تعلیمات انسان کو اس بات پر تیار کرتی ہیں کہ اس کی اجتماعی جدوجہد صاف ستھری ہو، فرد سے متعلق تعلیمات جس میں عبادات، اخلاق، قلبی کیفیات سب چیزیں داخل ہیں، اگر انسان ان پر پوری طرح عمل پیرا نہ ہو اور ان تعلیمات میں اس کی تربیت ناقص ہو، پھر وہ اصلاح معاشرہ کا علم لے کر کھڑا ہو جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی کوششیں بارآور نہیں ہوتیں، اگر میں ذاتی طور پر اپنے اخلاق، کردار اور سیرت کے اعتبار سے اچھا انسان نہیں ہوں اور اس کے باوجود میں اصلاح معاشرہ کا علم لے کر کھڑا ہو جاؤں اور لوگوں کو دعوت دوں کہ اپنی اصلاح کرلو، تو اس صورت میں میری بات میں کوئی وزن اور کوئی تاثیر نہیں ہوگی، لیکن جو شخص اپنی ذاتی زندگی کو، اپنی سیرت کو، اپنے اخلاق و کردار کو مجلی اور مصفی بنا چکا ہے اور اپنی اصلاح کر چکا ہے، پھر وہ دوسروں کو اصلاح کی دعوت دیتا ہے تو اس کی بات میں وزن بھی ہوتا ہے، پھر وہ بات صرف کان تک نہیں پہنچتی، بلکہ دل پر جا کر اثر انداز ہوتی ہے، اس لیے جب ہم اپنے اخلاق کو سنوارے بغیر دوسروں کی اصلاح کی فکر لے کر نکل کھڑے ہوتے ہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب فتنوں کا سامنا ہوتا ہے، اس وقت ہتھیار ڈالتے چلے جاتے ہیں اور بلند اخلاق و کردار کا مظاہرہ نہیں کرتے، نتیجہ میں حب مال، حب جاہ کے فتنوں میں گرفتار ہو جاتے ہیں، پھر آگے چل کر اصل مقصد تو پیچھے رہ جاتا ہے اور کریڈٹ لینے کا شوق آگے آجاتا ہے، پھر ہماری ہر نقل و حرکت کے گرد یہ بات گھومتی ہے کہ کس کام کے کرنے سے مجھے کتنا کریڈٹ حاصل ہوگا؟ جس کے نتیجہ میں کاموں کے چناؤ کے بارے میں ہمارے فیصلے غلط ہو جاتے ہیں اور ہم منزل مقصود تک نہیں پہنچ پاتے۔‘‘

(اصلاحی خطبات: ۶/ ۲۶۳-۲۶۴)

R.N.I. No.
UPURD/2009/28748

Monthly
Payam-e-Arafat
Raebareli

Volume: 13 ✦ February 2021 ✦ Issue: 02

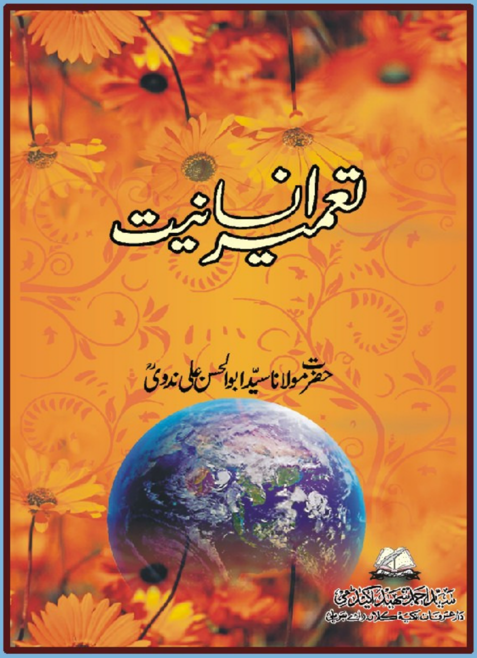

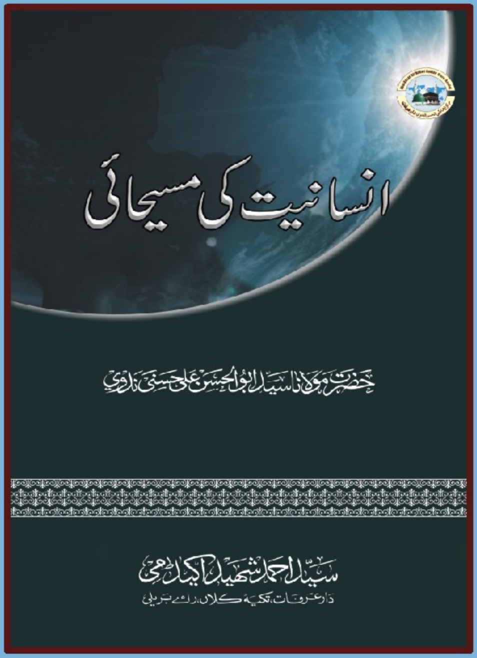

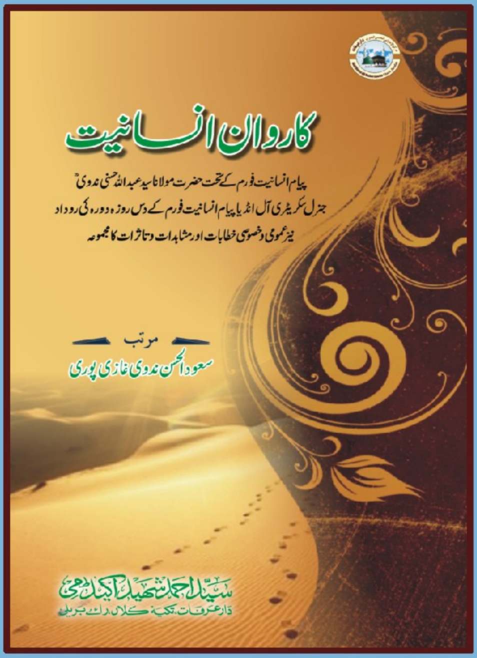

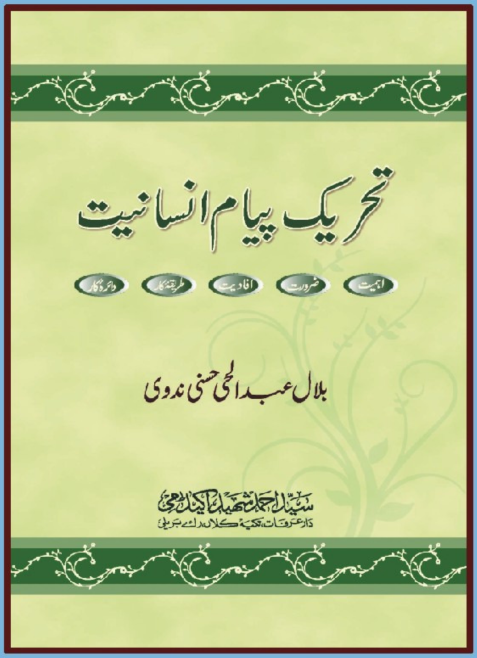

Editor: Bilal Abdul Hai Hasani Nadwi
MARKAZUL IMAM ABIL HASAN AL-NADWI
E-Mail: markazulimam@gmail.com - Dare Arafat, Takiya Kalan, Raebareli (U.P.) 229001 - Mobile: 9565271812
Printed & Published by: Mohammad Hasan Nadwi, On Behalf of Markazul Imam Abil Hasan Al-Nadwi.
Printed at S.A. Offset Printers, masjid ke Peeche, Phatak Abdullah Khan, Sabzi Mandi, Station Road, Raebareli (U.P.)